وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا

اسلامی زندگی کی بابت احادیثِ صحیحہ کا مستند

تشریحی مجموعہ

تحفہ حدیث

مُرتّب

مولانا محمد امین اثری

ناشر

مکتبہ تعمیر انسانیت، اردو بازار، لاہور

وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا

اسلامی زندگی کی بابت احادیثِ صحیحہ کا مستند
تشریحی مجموعہ

تحفہ حدیث

مرتبہ

مولانا محمد امین اثری

ناشر

www.KitaboSunnat.com

مکتبہ تعمیر انسانیت، اردو بازار، لاہور

ضابطہ

طابع ——— محمد سعید اللہ صدیقی بن شیخ محمد قمرالدین مرحوم

ناشر ——— مکتبہ تعمیرِ انسانیت، لاہور

مطبع ——— زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور

طبع ——— 1997ء

تعداد ——— ایک ہزار

قیمت ——— -/۷۵ روپے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرضِ مؤلف

کتاب اللہ اور سنّت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسلامی شریعت کے معروف و مُسَلَّم ماخذ و مصدر ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ ہی سے ہم تک پہونچی ہے، ہم اللہ تعالیٰ اور اس کی تعلیمات کو آپ ہی کے بتانے سے جانتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی کتاب کو بھی آپ ہی کی تشریحات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

قرآن مجید تیئیس ۲۳ برسوں میں تدریجی طور پر اور ایک خاص ترتیب کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ اور آپ نے جس طرح اور جن جن موقعوں پر اپنے قول و عمل سے اس کی تشریح فرمائی یا اس کے مجمل احکام کی تفصیل بتائی، وہ بھی آپ کے جان نثار صحابیوں کے حافظوں اور نوشتوں میں ثبت ہوتی گئیں۔ کتاب اللہ کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لے لی ہے۔ سنّتِ رسول کے تحفظ و بقا کی طرف صحابہ اور ان کے شاگردوں نے خاص توجہ کی، یہ انہی بزرگوں کی والہانہ عقیدت، غیر معمولی اخلاص اور انتھک سعی و عمل کا نتیجہ ہے کہ احادیث نبوی محفوظ ہوگئیں اور ان کی جانچ کا ایک ایسا معقول معیار وجود میں آگیا جس کی نظیر دنیا کے مذاہب کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

قرآن مجید میں انبیاء کے ذکر کے سلسلہ میں آتا ہے کہ انھیں کتاب اللہ کے علاوہ ایک اور چیز "حکمت یا حکم" نامی چیز دی گئی ہے۔ اسی طرح رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم کی صفت تعلیم کتاب کے ساتھ تعلیم حکمت بھی بیان کی گئی ہے۔ اکثر ائمہ دین کے نزدیک اس سے مراد سنت ہے جس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نوازا اور سرفراز کیا گیا ہے۔ الغرض "حکمت" سے مراد وہ احکام واقوال ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بحیثیت شارع صدور میں آئے اور جن کا اتباع مسلمانوں پر واجب ہے۔ ہم نے اسی سنت کے انتھاہ سمندر میں سے ان موتیوں کو جو انسان کی عملی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں چن کر ایک گلدستہ تیار کیا ہے اور اردو زبان میں وضاحت اور تفصیل سے اس کی تشریح کی ہے تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منشاء کے سمجھنے میں کسی قسم کی دشواری اور دقت نہ ہو۔ اس گلدستہ میں انہی موتیوں کا انتخاب کیا ہے جو سچے، کھرے اور مختصر تھے تاکہ آسانی سے انسانی دل و دماغ کے صفحات پر ٹانکے جا سکیں اور ان کی تابناکی اور جگمگاہٹ سے کفر و ضلالت کی تاریکیاں دور ہوں اور انسانیت کو راحت و سکون نصیب ہو۔

محمد امین اثری

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مضامین

کتاب "تحفۂ حدیث"

اللہ تعالیٰ کا حق

عن معاذ بن جبل قال كنت ردف النبي صلى الله عليه و سلم۔ ليس بيني وبينه الا مؤخرة الرحل۔ فقال يامعاذ بن جبل! فقلت لبيك يا رسول الله وسعديك ثم سار ساعة۔ ثم قال يامعاذ بن جبل! فقلت لبيك يارسول الله وسعديك ثم سار ساعة۔ ثم قال يامعاذ بن جبل! فقلت لبيك يارسول الله وسعديك قال، هل تدري ماحق الله عز وجل على العباد؟ قال قلت الله ورسوله اعلم۔ قال فان حق الله على العباد ان يعبدوه ولا تشركوا!

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سواری پر بیٹھا ہوا (آپ کے ساتھ جارہا تھا) میرے اور آپ کے درمیان بس کجاوے کی لکڑی کا فاصلہ تھا، (چلتے ہوئے) آپ نے مجھے پکارا "معاذ! میں نے عرض کیا یارسول اللہ دل وجان سے حاضر ہوں، ارشاد فرمائیے، آپ خاموش رہے، کچھ دیر چلنے کے بعد آپ نے پھر مجھے پکارا، معاذ! میں نے عرض کیا یارسول اللہ ارشاد فرمائیے تعمیل کے لئے دل وجان سے حاضر ہوں۔ آپ پھر خاموش رہے۔ کچھ ہی دیر چلے کہ آپ نے پھر مجھے پکارا، معاذ! میں نے عرض کیا یارسول اللہ دل وجان سے حاضر ہوں فرمائیے فرمایا" جانتے ہو اللہ کا اپنے بندوں پر کیا حق ہے؟ میں نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسول ہی زیادہ جانتے ہیں۔ ارشاد فرمایا بندوں پر اللہ کا حق یہ ہے کہ وہ صرف اسی کی عبادت کریں اور

بہ شیئاً۔ ثم سار ساعۃً	اس کے ساتھ کسی کو ذرا بھی شریک نہ کریں، اس
ثم قال یا معاذ بن جبل	کے بعد تھوڑی دیر اور چلے اور پھر مجھے آواز دی،
قلت لبیک یا رسول اللہ	معاذ! میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ارشاد فرمایئے
وسعدیک۔ قال ھل	دل وجان سے خدمت بجالاؤں۔ فرمایا جانتے ہو
تدری ماحق العباد علی	بندوں کا اللہ پر کیا حق ہے جب وہ اس کا حق
اللہ اذا فعلوا ذالک۔ قلت اللہ	ادا کریں؟۔ میں نے عرض کیا، اللہ اور اللہ کے
ورسولہ اعلم۔ قال ان لا یعذب	رسول ہی خوب جانتے ہیں۔ فرمایا صرف اللہ کی عبادت
من لا یشرک بہ شیئاً	کرنے والے بندوں کا اللہ پر یہ حق ہے کہ وہ انہیں
(متفق علیہ)	عذاب نہ دے"

تشریح:۔ توحید کی تعلیم کا یہ ایک انوکھا اور مؤثر ترین انداز ہے۔ اس تعلیم سے تین باتوں پر روشنی پڑتی ہے، توحید کی اہمیت، توحید کا مفہوم، توحید کا اجر۔

توحید کی اہمیت:۔ توحید ایک اہم ترین حقیقت ہے اور دین کی ساری عمارت اسی بنیاد پر تعمیر ہوتی ہے۔ آپ نے توحید کو اللہ کا حق بتایا، حق کی ادائیگی عقل وفطرت اور انسانیت کا ناقابلِ انکار تقاضا ہے۔ شرافت اور انسانیت جیسے بے بہا جوہروں سے آراستہ انسان کبھی تصور بھی نہیں کرسکتا کہ وہ کسی کا حق ادا نہ کرے، کسی محسن کا احسان بھلادے اور ناشکرا بن جائے۔ اس طرزِ خطاب میں انسان کے جذبۂ شکر اور جذبۂ احسان مندی کو بہترین انداز میں ابھارا گیا ہے توحید، محسنِ حقیقی کا ایک حق ہے اور اس حق کو ادا نہ کرنے والا درحقیقت عقل، شرافت، انسانیت جیسے انمول جوہروں سے خالی ہے اور اس کی حیثیت مجرم کی ہے جس کی سزا یہ ہے کہ ایسا انسان ہمیشہ کے لئے اللہ کی رحمتوں سے محروم کردیا

جائے اور عذاب الیم کے شعلے اسے ہمیشہ گھیرے رہیں۔ توحید کی اہمیت کی اس سے بڑی وجہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ یہ عذاب سے بچنے کا ذریعہ ہے۔ ایک مومن کی تگ و دو کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہے کہ وہ اپنے جسم و جان کو عذاب سے بچا لے۔ اور عذاب سے بچنے کا انحصار اس بات پر ہے کہ اللہ کے حق کو ادا کیا جائے۔

توحید کا مفہوم :۔ تنہا اللہ کی عبادت کرنا اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا توحید کا جامع بیان ہے۔ عبادت کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کو اپنی عاجزی، احتیاج، تذلل اور بے چارگی کا پورا پورا شعور ہو، اور اسے یہ یقین حاصل ہو کہ وہ ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کا محتاج ہے، اس یقین اور شعور کے ساتھ وہ اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کردے اور اس کا کامل بندہ بن کر رہے، اسی کی پرستش کرے، اسی سے دعا مانگے، اسی سے مدد چاہے، اسی کی اطاعت کرے اور زندگی کے ہر معاملہ میں اسی کے حکم کے آگے گردن جھکائے۔ اپنی محبتوں اور عقیدتوں کا مرکز اسی کو بنائے، خوشی اور غم میں، مصیبت اور راحت میں، ناداری اور خوشحالی میں، صحت اور بیماری میں، غرض زندگی کے نشیب و فراز میں صرف خدا ہی کو پکارے۔ اسی کی طرف لپکے، اسی کا قرب تلاش کرے، اسی کی رضا کو مقدم رکھے اور زندگی کے کسی موڑ پر ذرا بھی کسی کو خدا کا شریک و ساجھی نہ ٹھہرائے نہ اس کی ذات و صفات میں، نہ قدرت و اختیار میں، نہ اس کے حکم و قانون میں، اللہ کی زمین میں اللہ ہی کا شکر گذار بندہ بن کر رہے اور اسی کی مرضی پوری کرنے کے لئے پوری زندگی لگا دے۔

توحید کا اجر :۔ دنیا میں اللہ کے عذاب سے بچنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو ہدایت نصیب ہو اور اس پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوں، آخرت میں عذاب سے نجات کے معنی یہ ہیں کہ اسے جہنم کی آگ سے بچا یا جائے اور دائمی سکون کا ٹھکانہ جنت اسے عطا

کیا جائے جہاں ہمیشہ کے لئے اُسے اپنے مولا کی خوشنودی حاصل ہو اور ہمیشہ اس پر رحمتوں کی بارش ہو۔ ظاہر ہے کہ کسی انسان کا منتہائے مقصود اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس دنیا میں ہدایت کی راہ پر گامزن رہے، رحمت خداوندی کا مستحق بنے اور آخرت میں اسے رب کی رضا حاصل ہو، اس مقصود کو حاصل کرنیکا ذریعہ یہ ہے کہ انسان صرف اللہ کی عبادت کرے اور کسی کو اس کا ساجھی نہ بنائے اور یہ یقین رکھے کہ اللہ ہی انسان سمیت ساری کائنات کا خالق، پروردگار اور فرماں روا ہے۔ رات اور دن کا آنا جانا، موسم کی تبدیلی، بارش اور قحط، نفع اور نقصان ترقی اور تنزل، فتح و شکست، عزّت و ذلّت، زندگی اور موت سب کچھ اسی کے ہاتھ میں ہے۔ وہی مالک الملک ہے، بحر و بر میں اسی کا حکم چلتا ہے، وہ مالک و مختار ہے۔ اس کے حکم سے کوئی چیز باہر نہیں، دینا، لینا، مصیبت دور کرنا، راحت و آرام پہونچانا مُرادیں برلانا، یہ تمام اختیارات اسی کو حاصل ہیں۔ سب اس کے آگے عاجز و محتاج ہیں وہ کسی کا محتاج نہیں، وہ ہر ایک کا فریاد رس اور دُور و نزدیک کی پکار سُننے والا ہے۔ اِن تمام کاموں میں اس کا کوئی شریک و ساجھی نہیں، وہ اپنی تمام صفاتِ حمیدہ میں یکتا اور کمالات میں بے مثال ہے۔ سب عیبوں اور تمام نقائص سے پاک اور منزہ ہے۔

محبّتِ رسول ﷺ

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یومن احدکم حتّٰی اکون احب الیہ من والدہٖ وولدہٖ و الناس اجمعین۔ (بخاری ومسلم)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم میں سے کوئی آدمی اسوقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ مَیں اُسے اس کے ماں باپ، اولاد اور سب انسانوں سے زیادہ محبوب نہ ہُوں۔

تشریح: فطری طور پر ہر انسان کسی نہ کسی سے محبت رکھتا ہے۔ محبت کے درجے تو مختلف ہو سکتے ہیں، مگر ایسا کوئی شخص نہیں جو کسی سے محبت نہ رکھتا ہو۔ ماں، باپ، اولاد، بیوی، بھائی، بہن، دوست، احباب، اعزاء، اقرباء سب ہی سے محبت ہوتی ہے اور جس قدر کسی سے واسطہ اور راہ و رسم ہوا تنی ہی اس سے محبت بھی ہوتی ہے۔ ایک انسان کو دوسرے انسان سے کیوں محبت ہوتی ہے اس کے مختلف اسباب ہیں۔ اس کی ایک وجہ خونی و نسلی رشتہ ہے۔ ماں باپ اپنی اولاد سے اس لئے محبت کرتے ہیں کہ اولاد اُن کا گوشت پوست ہوتی ہے۔ بھائی بہن، اعزاء اور اقرباء سے بھی محبت اس لئے ہوتی ہے کہ اُن سے ہمارا خونی رشتہ ہے۔ محبت کی دوسری وجہ محبوب کے احسانات ہوتے ہیں۔ جس شخص کے ہم پر جتنے زیادہ احسانات ہوں گے اور اُن احسانات کا جس قدر ہمیں احساس ہوگا اسی قدر ہمیں اپنے محسن سے محبت ہوگی۔ ماں باپ سے محبت کی حقیقی وجہ یہی ہے کہ ہمارا وجود انھیں کا مرہونِ منت ہے اور وہ طویل مدت تک مصیبتیں اُٹھا کر اور قربانیاں دے کر ہمیں پالتے پوستے ہیں اسی طرح دوستوں اور بزرگوں کا معاملہ ہے جس دوست یا بزرگ کے ہم پر احسانات ہوں گے ہم اس سے محبت کریں گے۔ میاں، بیوی کی محبت کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔

محبت کی تیسری وجہ رفاقت ہے۔ جو افراد زندگی بھر یا کسی خاص مدت تک ایک دوسرے کے ساتھ رہتے اور ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں ان میں باہم محبت ہو جاتی ہے۔ اور انھیں ایک دوسرے کے بغیر چین نہیں آتا۔ ماں باپ، اولاد، میاں بیوی، اور دوست واحباب کے درمیان محبت کا راز یہی ہے۔

محبت کی چوتھی وجہ انسان کے کمالات ہیں۔ حسن وجمال، علم وعمل، کردار و اخلاق اور دوسری خوبیاں جن افراد میں ہوتی ہیں ہمارا دل ان کی طرف کھنچتا ہے اور ہم

اپنے آپ کو ان سے محبت کرنے پر مجبور پاتے ہیں۔ انسان کو جس کسی سے شدید محبت ہوتی ہے ہر قیمت پر اُسے راضی کرنے اور اُسے خوش رکھنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے اس کا ہر حکم مانتا ہے اور اُس کا ہر مطالبہ پورا کرتا ہے۔ محبت میں چون وچرا نہیں ہوتی۔ محبت کرنے والا اپنے آپ کو محبوب کے حوالے کر دیتا ہے کہ وہ جس طرح چاہے اس سے کام لے۔ اب اگر محبت کسی ایسے شخص سے ہے جو دانا وبینا ہے اور جو انسان کو صحیح راہ پر لگا سکتا ہے تو یہ محبت انسان کی کامیابی کی ضامن ہوتی ہے لیکن اگر محبت کسی ایسے شخص سے ہو جائے جو نادان ہو اور جو اپنے ساتھ محبت کرنے والے کو بھی پستیوں کے گڑھے میں گرا سکتا ہو تو یہ محبت انسان کو ڈبو دے گی اور وہ دنیا وآخرت میں کہیں کا نہیں رہے گا۔

اوپر محبت کے جن وجوہ کا ذکر کیا گیا ہے ان کے لحاظ سے محبت کا سب سے زیادہ مستحق اللہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اللہ سے ہمارا کوئی خونی رشتہ نہیں ہے مگر ہمارا اس سے بڑھ کر رشتہ ہے اور وہ یہ کہ وہ ہمارا خالق ہے اور ہمارا پورا وجود اسی کا بنایا اور بخشا ہوا ہے۔ جہاں تک احسانات کا تعلق ہے اللہ سے بڑھ کر ہم پر کسی کے احسانات نہیں ہیں۔ ہمارا وجود، ہمارا جسم، ہماری جان، ہمارے سارے اعضاء، ہماری صلاحیتیں، ہمارے ذرائع ووسائل اور وہ سب کچھ جو ہمارے پاس ہے اللہ ہی کا بخشا ہوا ہے۔ بلاشبہ ماں باپ کے ہم پر بہت احسانات ہیں لیکن ماں باپ کو بھی اللہ ہی نے پیدا کیا ہے اسی نے ان کے دلوں میں اولاد کی محبت ڈال دی اور وہ اسی کی بخشی ہوئی نعمتوں سے اولاد کو پالتے ہیں۔ اسی طرح دنیا میں جو شخص کسی پر احسان کرتا ہے اللہ کی دی ہوئی توفیق اور اس کی بخشی ہوئی نعمتوں سے کرتا ہے۔ جہاں تک رفاقت کا تعلق ہے اللہ سے بڑھ کر کوئی رفیق نہیں۔

وہ اُس وقت انسان کا رفیق ہوتا ہے جب وہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے اور پیدا ہونے سے لے کر مرتے دم تک زندگی کے ہر ہر مرحلے میں وہی ہمیں پالتا ہے، ہماری بگڑی بناتا ہے، ہماری مشکلیں دور کرتا ہے اور ہمارے کام آتا ہے۔ اگر وہ نگاہ پھیر لے تو پھر کوئی ہمارے کام نہیں آ سکتا۔ اسی طرح سب سے زیادہ صاحبِ کمال اللہ ہی ہے۔ تمام کمالات اور حسن و جمال کا سرچشمہ ہے۔ دنیا میں جہاں کہیں کوئی خوبی، کوئی کمال، کوئی حسن و جمال ہے تو اللہ ہی کا کمال اور اُس کے حسن و جمال کا ادنیٰ پر تو ہے۔ غرض جس پہلو سے بھی آپ غور کریں اللہ ہی محبت کا سب سے زیادہ مستحق ہے۔ اور اس لائق ہے کہ ہم اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیں اور والہانہ اس کی اطاعت و بندگی میں لگ جائیں۔

اللہ کے بعد جو ہستی ہماری محبت کی سب سے زیادہ مستحق ہے وہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ بلاشبہ ہم میں سے بہتوں کا آپ سے خونی رشتہ نہیں ہے لیکن ہمارا ایمانی، روحانی، اخلاقی اور انسانی وجود سرتا سر آپ کی تعلیم کا نتیجہ ہے، جہاں تک احسانات کا تعلق ہے اللہ کے بعد آپ کے احسانات سب سے زیادہ ہیں۔ آپ کی بدولت ہمیں ایمان ملا، اسلام کی دولت ملی، انسانیت کی راہ ملی، زندگی گذارنے کا صحیح ڈھنگ معلوم ہوا۔ دنیا کی کامیابی اور جنّت کی ابدی نعمتوں کے حصول کی راہ واضح ہوئی، اللہ تعالیٰ سے ہمارا تعلق استوار ہوا۔ مختصر یہ کہ دنیا و آخرت کی ساری نعمتیں آپ کی تعلیمات کے نتیجہ میں ہمیں حاصل ہوئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ انسانوں کے خصوصاً مسلمانوں کے محسنِ اعظم ہیں، جہاں تک رفاقت کا تعلق ہے بلاشبہ آپ کی مادی رفاقت ہمیں حاصل نہیں ہے لیکن آپ کی تعلیمات، آپ کی سیرت اور آپ کی ہدایت و رہنمائی کی شکل میں جو قیمتی رفاقت ہمیں حاصل ہے اور جو قیامت

تک ہمیں حاصل رہے گی وہ دنیا کی ہر رفاقت سے بڑھ کر مفید اور کارگر ہے۔ یہی نہیں ہمیں آخرت میں بھی آپ کی رفاقت حاصل ہوگی اور آپ شفاعت کی شکل میں گنہگار بندوں کے لئے اللہ سے دُعا فرمائیں گے اور اللہ کے نیک بندے جنت میں آپ کی رفاقت کا شرف پائیں گے۔ جہاں تک کمالات کا تعلق ہے آپ انسانوں میں سب سے بڑھ کر صاحبِ کمال انسان ہیں۔ جس پہلو سے بھی دیکھئے آپ کی سیرت اعلیٰ اور آپ کی زندگی مثالی ہے۔ ہم تاریخ انسانی میں کسی بھی انسان سے واقف نہیں جو آپ سے بڑھ کر تو کیا، آپ کے برابر بھی جامع، کامل اور متوازن شخصیت کا مالک ہو۔ اگر حسن و کمال کی بنا پر ہم محبت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں تو ہمیں اللہ کے بعد سب سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کرنی چاہیئے۔ اور ہر محبت پر آپکی محبت مقدم ہونی چاہیئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سب سے زیادہ محبت کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم آپ کی تعریف و توصیف کے قصیدے پڑھیں، بلکہ آپ سے سب سے زیادہ محبت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے رشتے کو ہر رشتے پر مقدم رکھیں۔ آپ کے احکام کی مخلصانہ اطاعت کریں۔ دنیا کے دوسرے انسانوں کی مرضی کے مقابلہ میں آپ کی مرضی کو ترجیح دیں۔ ماں باپ، اولاد اور دوسرے محبوب انسانوں کی محبت بے تامل آپ کی محبت پر قربان کردیں اور کسی بڑے سے بڑے اور محبوب سے محبوب شخص کے کہنے پر آپ کی نافرمانی کے لئے تیار نہ ہوں۔ ہم بے دریغ اپنے والدین، اپنے بیوی بچوں اور اپنے خاندان کے مفادات کو حکم خدا و رسول پر خوشی سے قربان کردیں اور جس طرح اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی بندگی اور اس کے دین کی دعوت و اقامت کا کام کیا ہے آپ کی پیروی میں اسی طرح ہم بھی اللہ کی بندگی، اس کے دین کی پیروی اور اس کے دین کی دعوت و تبلیغ میں لگ جائیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی طرح اسلام کی راہ میں جان و مال، وقت اور ہر چیز کی قربانی دیں۔

رسالتِ محمدی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" اس (خدا) کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے اس امت میں سے جو شخص یہودی ہو یا عیسائی، میری دعوت کو سُنے اور پھر اس (دین) پر جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں ایمان لائے بغیر مر جائے وہ (یقیناً) دوزخی ہوگا۔	قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم والذی نفس محمد بیدہٖ لا یسمع بی احد من ھذہٖ الامۃ یھودی ولا نصرانی ثم یموت ولم یومن بالذی ارسلت بہ اِلّا کان من اصحاب النّارِ۔ (مسلم)۔

تشریح: اس امت سے مُراد آپ کی اُمّتِ دعوت یعنی مخاطبین ہیں اور یہ بات قرآن وحدیث سے واضح ہے کہ آپ کی بعثت سے لے کر قیامت تک کے سارے انسان آپ کے مخاطب ہیں۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اسلام اور نبوت محمدی کا منکر دوزخی ہے خواہ وہ پچھلے انبیاء کو مانتا ہو۔ بشرطیکہ وہ آپ کے مخاطبین میں ہو اور اس تک آپ کی دعوت پہونچ چکی ہو۔ جن لوگوں تک آپ کی دعوت نہیں پہونچی ان پر اس حکم کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اللہ ظالم نہیں ہے کہ لوگوں کو دوزخ میں خواہ مخواہ ڈھکیل دے اور وہ جانتے نہ ہوں کہ دعوت محمدی کیا ہے؟ اور اس پر ایمان لانا کس حد تک ضروری ہے۔ جو لوگ آپ کی دعوت کو نہ مانیں وہ دوزخی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ آخرت کی نجات اللہ کی رضا جوئی و بندگی پر موقوف ہے اور اللہ کی بندگی اور رضا کی راہ رسول ہی سے معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے اللہ کی بندگی کے لئے اس کے رسولوں پر ایمان لانا اور ان کی اطاعت

کرنا ناگزیر ہے۔ جو لوگ اللہ کو مانتے ہیں مگر رسولوں کو نہیں مانتے یا کچھ رسولوں کو مانتے ہیں اور کچھ کو نہیں مانتے، وہ دراصل اللہ کی بندگی کرنا نہیں چاہتے، ایسے لوگ کافر ہیں اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَ رُسُلِہٖ وَیُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَ یَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَکْفُرُ بِبَعْضٍ وَّ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِکَ سَبِیْلًا ۝ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ حَقًّا ج وَ اَعْتَدْنَا لِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّھِیْنًا ۝ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَ رُسُلِہٖ وَلَمْ یُفَرِّقُوْا بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْھُمْ اُولٰٓئِکَ سَوْفَ یُؤْتِیْھِمْ اُجُوْرَھُمْ وَکَانَ اللّٰہُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ۝ (النساء ۱۵۲)

یقیناً وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کردیں اور وہ کہتے ہیں کہ ہم کچھ رسولوں کو مانیں گے اور کچھ کو نہیں مانیں گے اور وہ بیچ کا کوئی راستہ نکالنا چاہتے ہیں ایسے لوگ قطعاً کافر ہیں اور ہم نے کافروں کے لئے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں کی ان کو اللہ عنقریب اجر عظیم عطا فرمائے گا۔ اور اللہ مغفرت فرمانے والا اور مہربان ہے۔

قرآن مجید میں ایک اور موقع پر یہود و نصاریٰ کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَکُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْھًا

اے اہل کتاب! ایمان لاؤ اس (وحی) پر جو ہم نے (محمدؐ) پر نازل کی ہے اور جو تمہارے پاس کی کتابوں کو سچا کرنے والی ہے قبل اس کے کہ ہم (رسول کی نافرمانی کے نتیجہ میں)

فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَآ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ط وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا۔	تمہارے چہروں کو مسخ کر ڈالیں اور انھیں پشت کی طرف لوٹا دیں یا انھیں اپنی رحمت سے دُور کردیں جس طرح اصحاب سبت کو اپنی رحمت سے دُور کر کے اُن پر عذاب نازل کیا تھا۔ اور اللہ کا فیصلہ نافذ ہو کر رہتا ہے۔
(پ۵ رکوع ۳)	

ایک اور مقام پر فرمایا گیا:

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ۭ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۝	اے اہل کتاب! تمہارے پاس ہمارا رسول آیا ہے جو کتاب الٰہی کی بہت سی تعلیمات کو جو تم (لوگوں سے) چھپاتے تھے تمہارے سامنے واضح کرتا ہے (تمہاری تحریفات کا پردہ چاک کرتا ہے) اور بہت سی (کارستانیوں) کو معاف بھی کر دیتا ہے یقیناً تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور اور کتاب مبین آچکی ہے۔
(پ۶۔ رکوع ۷)	

یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ماننے کی اس لئے بھی ضرورت ہے کہ انھوں نے حق کو انسانی تحریفات سے پاک کر کے خالص اور واضح شکل میں پیش کیا ہے ورنہ اس سے قبل تعلیمات الٰہی، انسانی خیالات میں گڈمڈ ہو کر رہ گئی تھیں چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا	ہلاکت ہے ان لوگوں کے لئے جو لکھتے ہیں کتاب کو اپنے ہاتھوں سے، پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ اس طرح

قَلِيلًا۔	(پ رکوع)	وہ تھوڑی سی دولت کما لیں۔"

یہ ایک حقیقت واقعہ ہے کہ توراۃ ہو، زبور ہو یا انجیل، ان میں سے کوئی بھی حقیقی شکل میں موجود نہیں ہے۔ ان میں خدائی تعلیمات انسانی الحاقات کے ساتھ گڈ مڈ ہو گئی ہیں۔ اور یہی حال دنیا کی دوسری مذہبی کتابوں کا ہے۔ ہندوستان کی مقدس کتابیں ہوں یا بیرون ہند کی، سب تحریفات کا شکار ہو چکی ہیں۔ اس زمین کے اوپر اور اس آسمان کے نیچے قرآن ہی ایک ایسی کتاب ہے جو انسانی تحریفات سے پاک، بلفظہٖ و بجنسہٖ موجود ہے۔ اس لئے جو شخص اللہ کی بندگی اور اس کی رضا جوئی کی راہ پر چلنا چاہتا ہو اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پر ایمان لا کر ان کا اتباع کرے۔

قرآن مجید سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ اللہ کے آخری نبی ہیں اور آپ پر اللہ نے اپنے دین کو مکمل کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّنْ	محمد تم میں سے کسی مرد کے باپ نہیں۔
رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُولَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ	وہ تو اللہ کے رسول اور خاتم الانبیاء
النَّبِيِّينَ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا	ہیں۔ اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

(پ ۲۲ رکوع ۲)

ایک اور جگہ فرمایا گیا ہے:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ	آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا
اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ	تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور اسلام کو تمہارا
لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔ (پ ۶ رکوع ۴)	دین بنا کر میں راضی اور خوش ہو گیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کے سارے

معاملات میں آپ کی اطاعت کی جائے اور اپنی خواہشات کو آپ کے لائے ہوئے دین کے تابع بنا دیا جائے۔ چنانچہ ایک موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اپنی خواہش کو اس دین کے تابع نہ کر دے جس کو میں لے کر آیا ہوں"۔

ایک اور موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"میری تمام اُمت جنّت میں جائے گی سوا اُن لوگوں کے جنھوں نے میرا انکار کیا"۔ کسی نے عرض کیا بھلا وہ کون ہے جس نے انکار کیا؟ فرمایا "جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوگا اور جس نے نافرمانی کی اس نے یقیناً میرا انکار کیا"۔ یعنی وہ شخص جنّت میں داخل نہیں ہوگا۔

عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے سامنے ایسی پُر اثر تقریر کی جس سے ہمارے دل کانپ اُٹھے اور بیساختہ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ ہم نے عرض کیا "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی یہ تقریر تو ایسی محسوس ہوتی ہے جیسے کوئی رخصت کر رہا ہو۔ اس لئے ہمیں کچھ وصیت کیجئے۔ فرمایا" میں تمہیں اس بات کی وصیت کرتا ہوں کہ خدا سے ڈرو اور سنو اور مانو، اگرچہ تم پر کوئی غلام ہی کیوں نہ حاکم بنا دیا گیا ہو۔ تم میں سے جو شخص زندہ رہے گا وہ عنقریب سخت اختلاف دیکھے گا اس وقت تمہیں میری سنّت اور میرے خلفائے راشدین کی سنّت پر چلنا ضروری ہے تم اسے اپنے دانتوں سے خوب مضبوط پکڑ لینا اور نئے نئے کاموں سے بچتے رہنا کیونکہ دین میں نیا کام پیدا کرنا گمراہی ہے"۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نجات کے لئے اللہ کے رسول اور اُن کے

سچے خلفاء کی روش کو مضبوطی سے تھامنا اور بدعات سے بچنا ضروری ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" انبیاء علیہم السلام پر مجھے چھ چیزوں کے ذریعہ عزت بخشی گئی ہے۔ مجھے جامع کلمات عطا کیے گئے، رعب کے ذریعہ میری مدد کی گئی، مال غنیمت میرے لئے حلال کیا گیا، زمین کو میرے لئے پاک اور سجدہ گاہ بنا دیا گیا اور پاکیزگی حاصل کرنے کا ذریعہ بھی (یعنی میری شریعت میں نماز صرف مخصوص عبادت گاہوں میں ہی نہیں بلکہ روئے زمین پر ہر جگہ پڑھی جا سکتی ہے اور پانی نہ ملے تو میری شریعت میں تیمم کر کے وضوء کی ضرورت بھی پوری کی جا سکتی ہے اور غسل کی بھی) مجھے تمام مخلوق کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا اور مجھ پر نبیوں کا خاتمہ ہوا"

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری اور مجھ سے پہلے گذرے ہوئے انبیاء کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے ایک محل بنایا اور خوب حسین وجمیل بنایا مگر ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ چھوٹ ہوئی تھی، لوگ اس عمارت کے گرد پھرتے تھے اور اس کی خوبی پر اظہار حیرت کرتے تھے مگر کہتے تھے کہ اس جگہ اینٹ کیوں نہ رکھی گئی؟ تو وہ اینٹ میں ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں (یعنی میرے آنے پر نبوت کی عمارت مکمل ہو چکی ہے اب کوئی جگہ باقی نہیں جسے پُر کرنے کے لئے کوئی نبی آئے)۔

ان آیات واحادیث سے واضح ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری نبی ہیں اور قیامت تک کے لئے تمام انسانوں کے رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ اس لئے قیامت تک کے تمام انسانوں کی نجات وفلاح آپ پر ایمان لانے اور آپ کا اتباع کرنے پر منحصر ہے۔ ان آیات واحادیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر اپنے

دین کو مکمل کر دیا، اس لئے اب پچھلی شریعتوں پر عمل کرنے کے بجائے جو اپنے اپنے زمانہ میں مکمل ہونے کے باوجود شریعت محمدی کے مقابلہ میں ناقص ہیں، آپ کا اتباع اور آپ کی شریعت کی پیروی ضروری ہے۔ چنانچہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تورات کا ایک نسخہ لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہونچے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! یہ تورات کا نسخہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سن کر خاموش رہے۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ تورات کے نسخہ کو پڑھنے لگے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ (مارے غصہ کے) تمتما اٹھا، اور متغیر ہوگیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا (اے عمر) کھونے والی تجھ کو کھوئے (تیرا برا ہو) کیا تو دیکھتا نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روئے مبارک کا (مارے غصہ کے) کیا حال ہو رہا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کے چہرے کو دیکھ کر کہا کہ میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے غصہ سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں۔ ہم راضی ہیں اللہ سے بحیثیت رب کے، اسلام سے بحیثیت دین کے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بحیثیت نبی کے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے اگر موسیٰ علیہ السلام بھی ظاہر ہو جاتے اور تم مجھے چھوڑ کر ان کی پیروی کرتے تو تم سیدھے راستے سے ہٹ جاتے اور گمراہ ہو جاتے۔ اگر موسیٰ علیہ السلام زندہ ہو جاتے اور وہ میری نبوت کو پاتے تو وہ بھی میری اطاعت و فرمانبرداری کرتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ ہم زندگی کے سارے کاموں میں آپ کو اپنا پیشوا بنائیں، ہمیشہ، ہر معاملہ میں آپ کے پیچھے پیچھے چلیں اور جو حکم دیں پورے ادب و احترام کے ساتھ اس کے آگے سر جھکا دیں

اور اس میں کوئی بحث اور چون وچرا نہ کریں ۔ قرآن مجید میں ہے :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ

(۱-۲ الحجرات)

اے ایمان لانے والو! اللہ اور اس کے رسول کے آگے نہ بڑھو اور اللہ سے ڈرو یقیناً اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اے ایمان لانے والو! نبی کی آواز پر اپنی آواز بلند نہ کرو اور ان سے زور زور سے اس طرح باتیں نہ کرو جس طرح تم آپس میں زور زور سے باتیں کرتے ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال رائیگاں ہو جائیں اور تمہیں احساس بھی نہ ہو۔

ایک اور مقام پر فرمایا :

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔

(پ ۵ رکوع ۵)

تو نہیں (اے نبی) تمہارے رب کی قسم یہ لوگ مومن نہیں ہوں گے جب تک کہ ایسا نہ ہو کہ یہ اپنے سارے اختلافات میں تمہیں اپنا حکم بنائیں پھر تم جو فیصلہ کر دو اسے سن کر اپنے جی میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور بے چون وچرا اس کے آگے سر تسلیم خم کر دیں۔

رسول کی اطاعت

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

مَنْ اَطَاعَنِی فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ وَ

جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت

مَنۡ عصانی فقد عصی اللہ۔ | اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ (بخاری)

تشریح: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے لئے وہی باتیں فرمائی ہیں جن کا اللہ کی طرف سے حکم ہوا ہے۔ آپ اپنی طرف سے کچھ نہیں فرماتے۔ قرآن مجید میں ہے:

وَمَا يَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰی ۝ اِنۡ هُوَ اِلَّا وَحۡیٌ يُّوۡحٰی۔ (پ۲۷ رکوع ۴) | وہ اپنی خواہش سے کوئی بات نہیں کہتے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں وحی کی بنا پر کہتے ہیں جو اُن پر نازل کی جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو اللہ کی اطاعت قرار دیا گیا۔ قرآن مجید میں ہے:

مَنۡ يُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰهَ۔ (پ۵ رکوع ۷) | جو رسول کی اطاعت کرے گا وہ یقیناً اللہ کی اطاعت کرے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ دُنیا اور آخرت دونوں کی کامرانی اللہ کی بندگی اور اطاعت پر موقوف ہے اور اللہ کی اطاعت و بندگی کا اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ اللہ کے رسولوں کی اطاعت کی جائے۔ اللہ تعالیٰ رسولوں کو اس لئے منتخب کرتا ہے کہ اُن پر اپنا دین نازل فرمائے۔ اور وہ دوسروں کو اللہ کی مرضی اور اس کے دین سے آگاہ کردیں۔ اس لئے اطاعت رسول کا حاصل اللہ کی رضا اور دُنیا کی کامرانی ہے، اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کا حاصل اللہ کا غضب اور دُنیا و آخرت کی ناکامی ہے۔ اسی حقیقت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ "میری اُمت کے سارے لوگ جنت میں جائیں گے سوائے اُن کے جو

انکار کریں، آپ سے سوال کیا گیا کہ آپ کا انکار کرنے والے کون ہیں؟ آپ نے فرمایا جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں ضرور جائے گا، اور جس نے میری نافرمانی کی تو اس نے یقیناً میرا انکار کیا۔

آپ کے اس ارشاد سے دو باتیں معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ آپ کی اطاعت کا نتیجہ جنت کی ابدی نعمتیں ہیں، دوسری یہ کہ آپ کی دانستہ نافرمانی آپ کے انکار کے ہم معنی ہے۔ اسی بات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور موقع پر اس طرح واضح کیا ہے "تم میں سے کوئی آدمی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی خواہشات اس کے دین کے تابع نہ ہو جائیں۔"

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو دنیا اور آخرت میں جو غیر معمولی کامرانی نصیب ہوئی وہ اللہ و رسول کی اطاعت ہی کا نتیجہ تھی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ تاریخ انسانی میں انبیاء علیہم السلام کے ماسوا ان سے بہتر افراد اور ان کے معاشرے سے بہتر کسی معاشرے کا پتہ نہیں چلتا، صحابہ کرام انسانیت، کردار، تقویٰ، اخلاق، اور خدا ترسی میں اس قدر جامع، متوازن اور کامل نمونہ تھے کہ رہتی دنیا تک انسانیت ان سے حسن کردار اور تقویٰ کا سبق سیکھتی رہے گی۔ یہ سب اطاعت خدا و رسول کا ثمرہ تھا۔ گوشۂ گمنامی سے اٹھے اور متمدن دنیا کے بہت بڑے حصے پر چھا گئے۔ لاکھوں کروڑوں انسانوں کو ان سے ہدایت ملی۔ ان کے ہاتھوں دنیا میں انصاف، انسانیت، خیر و صلح اور اللہ کے دین کا پرچم بلند ہوا۔ جو ان سے ٹکرایا پاش پاش ہو گیا اور دنیا کی جن عظیم طاقتوں سے ٹکرائے انھیں ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیا، یہ سب کچھ اطاعتِ خدا و رسول کا ثمرہ تھا۔ صحابہ کرام چھوٹی سے چھوٹی چیز سے لے کر بڑی سے بڑی چیز تک ہر معاملہ میں بے چون و چرا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرتے تھے

اور اس مقصد کے لئے اپنا وقت، اپنا مال، اپنے تعلقات، اپنا خاندان اور اپنی جان، ہر چیز قربان کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔

ہم بھی آج صحابہ کرام کی روش کی پیروی کر کے، خدا و رسول کی اطاعت کر کے دنیا میں سربلند اور آخرت میں کامیاب و کامران ہو سکتے ہیں۔

نماز

قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
بَيْنَ الْعَبْدِ وَبَيْنَ الْكُفْرِ تَرْكُ الصَّلٰوةِ۔ (مسلم)	"بندہ اور کفر کے درمیان نماز چھوڑ دینے کا فاصلہ ہے"

تشریح: اللہ اور رسول پر ایمان لانے اور توحید و رسالت کا اقرار کر لینے کے بعد سب سے اہم فریضہ جو بندہ پر عائد کیا گیا ہے وہ نماز ہے۔

"نماز" دن میں پانچ دفعہ بندوں پر فرض کی گئی ہے۔ قرآن شریف میں بے شمار آیات میں صراحتًا اور اشارۃً نماز کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بڑی تاکید فرمائی ہے اور اس کو دین کا ستون اور بنیاد قرار دیا ہے اور نماز کے چھوڑنے کو کفر بتایا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "بندہ اور کفر کے درمیان فرق صرف نماز چھوڑ دینے کا ہے" ایک اور موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "بے نمازی کا اسلام میں کچھ حصہ نہیں" ایک اور حدیث میں ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے نماز کی محافظت کی یعنی اس کو پابندی اور اچھی طرح سے ادا کیا تو وہ نماز اس کے لئے قیامت میں نور ہوگی اور

اس کے ایمان و اسلام کی دلیل، نجات اور جنت میں داخل ہونے کا ذریعہ بنے گی۔ اور جس نے اس کو پابندی سے ادا نہیں کیا تو اس کے لیئے نہ نور بنے گی اور نہ اس کے ایمان و اسلام کی دلیل اور نہ نجات کا ذریعہ، اور وہ شخص قیامت میں قارون، فرعون ہامان اور اُبَیّ بن خلف کے ساتھ ہوگا۔

نماز چھوڑنے والے کے بارے میں صحابہ کرام کی رائے یہ تھی کہ ایسا شخص مسلمان نہیں ہے۔ عبداللہ بن شقیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نماز کے علاوہ کسی عمل کے چھوڑنے کو کفر نہیں سمجھتے تھے۔

جو شخص پانچ وقت نماز ادا کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت کا مستحق ہو جاتا ہے اور اس کے گناہ معاف ہوتے ہیں اور اس کی زندگی گناہوں کے میل کچیل سے پاک و صاف ہوتی چلی جاتی ہے۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (صحابہ سے) دریافت کیا، تمہارا کیا خیال ہے تم میں سے کسی کے دروازہ کے سامنے دریا بہہ رہا ہو اور وہ شخص روز اس میں پانچ مرتبہ نہاتا ہو تو کیا اس کے جسم پر کچھ میل کچیل باقی رہے گا؟ صحابہ نے عرض کیا کہ اس کے جسم پر کچھ بھی میل باقی نہیں رہیگا۔ آپ نے فرمایا "پانچ وقت کی نمازوں کی مثال ایسی ہی ہے، ان کی برکت سے اللہ تعالےٰ گناہوں کو دور کر دیتا ہے"۔

یہاں یہ بات اچھی طرح جان لینی چاہیئے کہ وہی نماز حقیقتاً گناہوں کے دور کرنے کا سبب بنتی ہے جو اپنے تمام ظاہری آداب اور باطنی صفات کے ساتھ ادا کی گئی ہو، یعنی ٹھیک وقت پر اور جماعت کے ساتھ مسجد میں پانچوں وقت پابندی سے ادا کی گئی ہو، جس میں قرآن ٹھہر ٹھہر کر اور سمجھ کر پڑھا گیا ہو، رکوع اور سجدے

اطمینان سے کیے گئے ہوں، جسم، دل اور دماغ پر عاجزی اور فروتنی چھائی ہوئی ہو۔ نماز کے اذکار و افعال کا شعور و احساس ہو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور کیا کر رہا ہے۔ اس بات کا استحضار ہو کہ وہ اللہ کے سامنے کھڑا ہے اور اللہ سے باتیں اور عہد بندگی کر رہا ہے۔ مختصر یہ کہ اللہ کی خشیت، اس کی یاد، اس کے حضور حاضری کا احساس اور خشوع و خضوع نمازی کے دل و دماغ پر پوری طرح طاری ہو۔ اور اس نے پوری عاجزی و نیاز مندی کے ساتھ اپنے آپ کو اللہ کی بندگی کے لیے اس کے قدموں میں ڈال دیا ہو۔ کھلی بات ہے کہ ایسی نماز انسان کو اللہ کی نافرمانی سے بچائے گی، گناہوں سے دُور رکھے گی، گناہوں سے توبہ کرنے پر مجبور کرے گی اور اسے اللہ کا مقرب و مقبول بندہ بنائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں نماز کے بارے میں فرمایا گیا کہ وہ بے حیائی اور بُرائی سے روکتی ہے۔ صحیح معنوں میں وہی نماز، نماز ہوگی جس میں یہ صفات موجود ہوں اور جس میں یہ صفات موجود نہ ہوں وہ صورتًا نماز ہو تو ہو حقیقتًا نماز نہ ہوگی اور اس سے وہ فائدے کبھی حاصل نہ ہوں گے جو نماز کے فائدے ہیں، اور نہ اس کی مقبولیت ہی کی کوئی توقع ہے۔

زکوٰۃ

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
اِنَّ مِنْ تَمَامِ اِسْلَامِكُمْ اَنْ تُؤَدُّوْا زَكٰوةَ اَمْوَالِكُمْ۔ (بزار)	بلاشبہ تمہارے اسلام کی تکمیل یہ ہے کہ تم اپنے مالوں کی زکوٰۃ ادا کرو۔

تشریح: اسلام میں جس عمل پر نماز کے بعد سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے وہ زکوٰۃ ہے۔ یعنی خدا کی راہ میں خرچ کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے جو احکام

دیتے ہیں وہ سب کے سب خود انسانوں کے فائدے کے لئے ہیں، زکوٰۃ بھی اسی قسم کے اعمال میں سے ایک عمل ہے جس کے بہت سے فائدے ہیں۔

اس کا پہلا فائدہ یہ ہے کہ انسان کے پاس جو کچھ ہے اس کی صحیح حیثیت کا اسے احساس ہوتا ہے۔ جب آدمی اپنے کمائے ہوئے مال میں سے خدا کا حصّہ نکالتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کے متعلق یہ اعتراف کرتا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے اسے دیا گیا ہے۔ جس طرح کسی حکومت کے تحت تاجر جب اپنے حاصل شدہ منافع میں سے اس کے مطالبات ادا کرتا ہے تو درحقیقت وہ اس صورت واقعہ کو تسلیم کرتا ہے کہ حکومت کے انتظامات اگر نہ ہوتے تو وہ کاروبار سے نفع حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ یہی وہ چیز ہے جو کسی کو یہ حق دیتی ہے کہ وہ اپنی رعایا سے ٹیکس وصول کرے ٹھیک اسی طرح خدا کی راہ میں خدا کے حکم کے مطابق خرچ کرنا درحقیقت اس امر واقعی کو عملی طور پر تسلیم کرنا ہے کہ اس کائنات میں کام کرنے کے سارے مواقع اور وہ سب کچھ جو انسان حاصل کرتا ہے وہ براہ راست خدا کی دَین ہے اگر خدا نہ دیتا تو وہ ایک دانہ بھی حاصل نہ کر سکتا تھا۔

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ زکوٰۃ دینے والے کا مال دنیا کی حرص اور بُخل کے ناپاک جذبات سے پاک ہوجاتا ہے اور آخرت، نیکی اور تقویٰ کے کاموں کے لئے تیار ہوجاتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّى۔ (پ ۳۰ رکوع ۱۷)	اور اس جہنم سے دُور رکھا جائے وہ شخص جو اللہ سے بہت ڈرنے والا ہے اور جو اپنا مال دوسروں کو محض اسلئے دیتا ہے کہ اس کا نفس پاک وصاف ہو

ایک اور جگہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے فرمایا گیا:

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا۔ (پ۱۱ رکوع ۱)

ان کے مالوں سے صدقہ لو، جس کے ذریعہ انھیں پاک کروگے اور ان کا تزکیہ کروگے۔

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ صدقہ اور زکوٰۃ کی اصل غرض دل کی پاکی اور نفس کا تزکیہ ہے ہر شخص جانتا ہے کہ دنیا کی محبت ہی وہ چیز ہے جو خدا پرستی کی اصل دشمن ہے جو انسان کو خدا اور آخرت سے بیگانہ بنا کر رکھ دیتی ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "دُنیا کی محبت ہر بُرائی کی جڑ ہے"۔ اس محبت کا تعلق اگرچہ بہت سی چیزوں سے ہوتا ہے مگر ان میں سب سے زیادہ طاقتور اور خطرناک محبت مال کی ہوتی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مال ہی کو امت کے حق میں سب سے بڑا فتنہ قرار دیا ہے۔ اس لئے صاحب ایمان انسان مال کی محبت کی گرفت سے اپنے کو بچالے تو دوسری بہت سی چیزوں کی محبت سے آزادی کا راستہ آپ سے آپ کھل جاتا ہے۔ اس طرح ایک پھندے سے نجات دراصل دوسرے بہت سے پھندوں سے نجات کے ہم معنی ہے۔ دُنیوی پھندوں سے آزاد ہو جانا ہی اس کا پاک ہو جانا ہے۔

زکوٰۃ چونکہ قلب انسانی کو یہی آزادی عطا کرتی ہے اس لئے حقیقت یہ قرار پائی کہ وہ دِلوں کو پاک کرتی ہے، زکوٰۃ کی یہی بنیادی غرض ہے جس کی وجہ سے شریعت نے اس عمل کو "زکوٰۃ" کا نام دیا ہے۔ زکوٰۃ کے لفظی معنی پاکیزگی اور بڑھنے کے ہیں گویا اپنے مال کا ایک حصہ ضرورت مندوں کو رضائے الٰہی کی خاطر دے دینا زکوٰۃ کہلاتا ہے، اس سے نفس میں پاکی آتی ہے۔ اور اس کا نشو ونما ہوتا ہے۔

تیسرا فائدہ یہ ہے کہ ملّت کے نادار افراد کی مدد ہوتی ہے اور ان کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں، دین کی دعوت اور اس کی سربلندی کی راہیں ہموار ہوتی ہیں اور اس

سلسلہ میں جو مصارف درکار ہوتے ہیں اُن کا انتظام ہوتا ہے۔ زکوٰۃ اور انفاق فی سبیل اللہ کی بھی اہمیت ہے جس کے سبب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی غیرمعمولی فضیلت اور اجر بیان فرمایا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا "ہر روز جب بندے صبح کرتے ہیں تو دو فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک فرشتہ دعا کرتا ہے کہ اے اللہ خرچ کرنے والے کو خرچ کئے ہوئے کا بدل عطا فرما۔ اور دوسرا فرشتہ دعا کرتا ہے کہ اے اللہ خرچ نہ کرنے والے کے مال کو تلف کر دے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا" اے ابن آدم! اللہ کی راہ میں خرچ کر تجھ پر بھی خرچ کیا جائے گا۔" ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا" اے ابن آدم! اگر تو اپنی ضروریات سے بچے ہوئے مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کر دے گا تو یہ تیرے لئے بہتر ہوگا اور اگر اسے روک کر رکھے گا تو یہ تیرے لئے موجب شر ہوگا۔ اور ضروریات کے لحاظ سے مال رکھنے پر کوئی ملامت نہیں ہے۔ اور خرچ کرنے کے معاملہ میں ان لوگوں سے شروع کر جن کی ذمہ داری تجھ پر آتی ہے۔ ایک اور موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" ظلم سے بچو کیونکہ ظلم قیامت کے دن تاریکیوں کی شکل اختیار کریگا اور حرص و کنجوسی سے بچو۔ کیونکہ حرص اور بخل ہی نے تم سے پہلے کے لوگوں کو تباہ کردیا اور انھیں اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ لوگوں کے خون بہائیں اور حرام چیزوں کو حلال کریں

ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہونچا میں نے دیکھا کہ آپ کعبہ کے سائے میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ آپ نے جب مجھے دیکھا فرمایا" کعبہ کے رب کی قسم وہ لوگ حد سے زیادہ گھاٹے اور تباہی میں ہیں میں نے پوچھا میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، کون لوگ؟ آپ نے فرمایا وہ لوگ جن کے پاس دولت زیادہ ہے وہ تباہ اور برباد ہیں سوا اُن کے جو لوگ اپنے مال کو

اللہ کی راہ میں دائیں بائیں. آگے پیچھے خوب خرچ کریں اور ایسے لوگ بہت تھوڑے ہیں"۔

زکوٰۃ اور انفاق فی سبیل اللہ کے دو پہلو ہیں۔ ایک قانونی۔ دوسرا اخلاقی۔ قانونی پہلو سے مراد وہ فرض انفاق ہے جو مسلمانوں کو اپنی آمدنی میں سے لازماً کرنا ہے عام اصطلاح میں اسی کو زکوٰۃ کہا جاتا ہے۔ سال بھر کے بعد اگر کسی شخص کے پاس ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کی قیمت کا نقد روپیہ یا ساڑھے سات تولہ سونا یا اس کی قیمت کا نقد روپیہ ہو اور اس پر ایک سال گذر جائے تو اسے اپنے چاندی، سونے میں سے چالیسواں حصّہ، یا روپیہ میں سے ڈھائی فی صد کے حساب سے اللہ کی راہ میں ضرور خرچ کرنا چاہیئے۔ جو شخص کھیتی باڑی کرتا ہوُا ہے اپنی پیداوار میں سے دسواں حصّہ لازماً اللہ کی راہ میں خرچ کرنا چاہیئے۔ اگر یہ پیداوار آب پاشی کے بغیر محض آسمانی بارش سے ہوئی ہو، بصورت دیگر بیسواں حصہ۔ اسی طرح مال تجارت میں سے سال بھر کے بعد حساب کرکے ڈھائی فیصد کے حساب سے اللہ کی راہ میں خرچ کرنا چاہیئے[1]

فرض زکوٰۃ کی ادائیگی کی صحیح اسلامی شکل یہ ہے کہ اسلامی حکومت کے خزانے (بیت المال) میں جمع ہو اور وہیں سے ضرورت مندوں پر خرچ ہو۔ حکومت کے محصلین فرض زکوٰۃ وصول کریں گے اور حکومت کے بیت المال میں لاکر جمع کریں گے۔ قرآن مجید میں زکوٰۃ کے جو مصارف بیان ہوئے ہیں اُن میں سے ایک مصرف زکوٰۃ کے محصلین کا بھی ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ زکوٰۃ کا اجتماعی نظم ہونا چاہیئے اور اس اجتماعی نظم کے منتظمین کی تنخواہیں زکوٰۃ کی رقوم ہی سے ادا ہونا چاہیئے۔ قرآن مجید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ لوگوں سے زکوٰۃ وصول کریں۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے سربراہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ زکوٰۃ کا اجتماعی نظم

[1] یہاں پر مختصراً احکام زکوٰۃ بیان کردیئے ہیں تفصیلی احکام جاننے کیلئے کسی فقہ کی کتاب کی طرف رجوع کرنا چاہیئے

قائم کریں ۔ دورِ نبوی اور دورِ خلافتِ راشدہ میں زکوٰۃ کا اجتماعی نظم قائم تھا اور زکوٰۃ انفرادی طور پر ادا نہیں کی جاتی تھی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے خلیفہ ہونے کے بعد عرب کے کچھ قبیلوں نے زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کر دیا اور کچھ قبیلوں نے یہ کہا کہ ہم زکوٰۃ بطور خود خرچ کریں گے اسلامی بیت المال (خزانہ) میں نہیں دیں گے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایسے تمام لوگوں سے جہاد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے ان کے حکم پر ایسے تمام قبائل سے جہاد کیا بجز ان لوگوں کے جنھوں نے توبہ کر لی اور زکوٰۃ کو اسلامی حکومت کے بیت المال (خزانہ) میں ادا کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔

انفاق فی سبیل اللہ کا دوسرا پہلو اخلاقی ہے۔ فرض زکوٰۃ کے علاوہ اس میں صدقہ فطر اور دوسرے واجب صدقات بھی شامل ہیں۔ فرض زکوٰۃ کے علاوہ وہ تمام صدقات جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کئے جائیں، اور جو ایک مومن پر لازم نہ ہوں اس میں داخل ہیں۔ مومن کا کام صرف یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے مال میں سے فرض زکوٰۃ ادا کر دے اور اس کے بعد مطمئن ہو جائے کہ اس نے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا حق ادا کر دیا، اسے اللہ کی راہ میں زیادہ سے زیادہ خرچ کرنا چاہیئے اور یہ یقین رکھنا چاہیئے کہ اس کی دولت کا حقیقی مصرف یہی ہے۔ زکوٰۃ اور انفاق فی سبیل اللہ کی جو فضیلت ہے وہ اس صورت میں ہے کہ اسے کتاب و سنت کی ہدایت کے مطابق عمل میں لایا جائے اور ان ہدایات کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) زکوٰۃ دینے کا محرک صرف رضائے الٰہی ہو۔ (۲) جو زکوٰۃ دی جائے پاک کمائی سے ہو۔ (۳) زکوٰۃ لینے والے پر کوئی احسان نہ رکھا جائے اور نہ اس کی دل آزاری کی جائے ورنہ سارا کیا کرایا اکارت چلا جائے گا۔

روزہ

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
فاذا کان یوم احدکم فلا یرفث	جب تم میں سے کسی کا روزہ ہو تو چاہیئے کہ وہ نہ
یومئذٍ ولا یصخب فان سابّہ	شہوانی بات کرے۔ نہ شور مچائے۔ اگر کوئی اس
احد اوقاتلہ فلیقل انی صائمٌ	کو برا بھلا کہے یا اس سے لڑنے پر اتر آئے تو
(بخاری)	یہ کہہ دے کہ میں روزہ دار ہوں۔

تشریح: روزے کا شرعی اور اصطلاحی نام "صوم" ہے جس کے لغوی معنی "رکنے" کے ہیں۔ اس عمل کو صوم اس لیئے کہا گیا ہے کہ اس میں انسان صبح کی پو پھٹنے سے لے کر سورج کی ٹکیا غائب ہونے تک کھانے پینے اور جنسی ملاپ سے رکا رہتا ہے عرب کے لوگ گھوڑ دوڑ کے لیئے جب گھوڑے کو تیار کرتے ہیں تو اسے ایک دو روز فاقہ سے رکھتے ہیں تاکہ اس کا بدن چھریرا ہو جائے اور وہ گھوڑ دوڑ میں آگے بڑھ جائے ایسے گھوڑے کو وہ فرسٌ صائمٌ یعنی روزہ دار گھوڑا کہتے تھے۔ اس سے روزے کے مفہوم پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ جس طرح گھوڑے کی غذا کم کر کے گھوڑ دوڑ کے لیئے تیار کیا جاتا ہے اسی طرح روزہ اللہ کی راہ میں تیز گام بنانے کے لیئے فرض کیا گیا ہے۔

اسلام میں روزے کی غیر معمولی اہمیت ہے۔ یہ ان پانچ ارکان میں سے ہے جن پر اسلام کی پوری عمارت قائم ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اسلام کی بنیاد پانچ باتوں پر ہے۔ اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ (۲) نماز قائم کرنا۔ (۳) زکوٰۃ دینا۔ (۴) رمضان کے روزے رکھنا۔ (۵) اور بیت اللہ کا حج کرنا اگر اسکی استطاعت ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزے کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا:
"انسان کے ہر عمل کا اجر دس گُنے سے سات سو گُنے تک ملتا ہے لیکن روزے کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کا اجر دوں گا۔"
اس حدیث سے معلوم ہوا کہ روزے کے اجر کی کوئی حد نہیں۔ اللہ تعالیٰ جتنا چاہے گا اس کا اجر عطا فرمائے گا۔

لیکن روزے کی یہ اہمیت اور اس کی یہ فضیلت حقیقی روزے کے لئے ہے نہ کہ روزے کی شکل کے لئے۔ ہر عبادت کی طرح روزے کی ایک شکل ہے اور اس کی ایک حقیقت ہے۔ روزے کی حقیقت جو قرآن مجید اور صحیح احادیث سے معلوم ہوتی ہے وہ حسب ذیل ہے:

(۱)۔ تقویٰ: روزہ انسان میں خدا ترسی کی صفت اور تقویٰ کا جوہر پیدا کرتا ہے چنانچہ قرآن میں فرمایا گیا ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ	اے ایمان والو! تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے
الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ	جس طرح کہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا
قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ۔	گیا تھا۔ امید ہے کہ تمہارے اندر تقویٰ
(پ ۲ رکوع ۷)	پیدا ہوگا۔

تقویٰ اس بات کا نام ہے کہ انسان کا دل خدا کے خوف سے لبریز ہو اور وہ ہر اس کام سے بچے جس سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہو۔ اور ہر اس چیز کی طرف لپکے جس میں اللہ کی رضا ہو۔ روزے میں انسان اپنی جائز اور بنیادی ضرورتوں کو اللہ کے حکم سے چھوڑ دیتا ہے۔ اس فعل سے ایک طرف تو یہ یاد دلانا مقصود ہے کہ وہ اللہ کا بندہ ہے اور اسے ہر وقت اللہ کا بندہ بن کر رہنا چاہیئے۔ اگر اس کا حکم ہو تو اپنی جائز

اور بنیادی ضرورتوں سے بھی بے تامل کنارہ کش ہو جاتا ہے۔ دوسری بات یہ یاد دلانا مقصود ہے کہ جب بندۂ مومن نے اللہ کی رضا کے لیئے جائز اور بنیادی ضرورتیں چھوڑ دیں تو اُسے وہ کام اور چیزیں بدرجہ اَولیٰ چھوڑ دینا چاہیئے جو ناجائز اور اللہ کو ناپسند ہیں۔ اسی حقیقت کی طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا ہے کہ روزہ (بُرائیوں اور جہنم کے عذاب سے) بچنے کی ڈھال ہے۔ چنانچہ اس جملہ کی تشریح کرتے ہوئے آپؐ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کسی کا روزہ ہو تو چاہیئے کہ وہ نہ تو کوئی شہوانی بات کرے اور نہ اُودھم مچائے۔ اور اگر کوئی اُسے گالی گلوچ کرنے یا لڑنے جھگڑنے پر اُتر آئے تو (اس سے بھی اور اپنے جی میں بھی) کہے میں تو روزے سے ہوں۔''

اگرچہ بدکلامی اور لڑائی جھگڑا وغیرہ بُری حرکتوں سے بچنا ایک مومن کیلیئے ہر حال میں ضروری ہے لیکن جب وہ روزہ سے ہو تو بُری باتوں سے بچنا اور بھی زیادہ ضروری ہے۔

(۲) اللہ کی حاکمیت کا استحضار: روزہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کے یقین کو زندہ اور مستحضر کرتا ہے۔ سحر کا وقت آیا۔ اُٹھو، کھا پی لو۔ افق پر سفید دھاری دکھائی دینے لگی اپنے آپ کو کھانے پینے سے روک لو۔ اب شام تک ہر طرح کی پاک اور لذیذ نعمتیں رکھنے کے باوجود بھوکے پیاسے رہو۔ سورج ڈوب گیا، اب روزہ ختم کرو اور فوراً کچھ نہ کچھ ضرور ہی کھا پی لو۔ تھوڑی دیر آرام کر کے پھر اٹھو اور تراویح ادا کرنے میں لگ جاؤ۔ حکم اور تعمیل حکم کا آقائی اور غلامی کا یہ ایسا غیر معمولی مظاہرہ ہے جس کی نظیر کسی دوسرے عمل میں مشکل ہی سے ملے گی۔ یہ صورت حال بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے حاکم اور فرماں روائے مطلق ہونے کا عملاً اقرار ہے۔ روزے کی شکل سے یہ غلط فہمی ہو سکتی تھی کہ اس سے نفس کُشی مقصود ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو بغیر سحری روزہ رکھنے کا حکم دیا جاتا۔ افطار میں تاخیر افضل

ہوتی اور مسلسل روزہ رکھنا افضل قرار پاتا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہ سب چیزیں نہ صرف یہ کہ بہتر نہیں بلکہ ان کو شریعت میں ناپسند قرار دیا گیا ہے۔ سحر کے وقت نیند کو چھوڑ کر فوراً اٹھو۔ تھوڑا بہت ضرور کھاؤ پیو اور سحری میں جتنی تاخیر کرو اتنا ہی بہتر ہے۔ افطار کا وقت ہونے ہی افطار کر لو اور اس میں خواہ مخواہ تاخیر نہ کرو اور رمضان کے روزے کے علاوہ مسلسل روزے نہ رکھو۔ اور ایک روزہ افطار کئے بغیر دوسرا روزہ شروع نہ کرو۔ یہ سب باتیں اس حقیقت کا اعلان کرتی ہیں کہ روزے سے نفس کشی مقصود نہیں ہے۔ بلکہ اللہ کی حاکمیت و مالکیت اور اپنی بندگی اور محکومیت کا استحضار مقصود ہے۔ آقا جب کہے کھاؤ پیو فوراً کھانے پینے لگ جاؤ۔ جب کہے کھانا پینا چھوڑ دو فوراً کھانے پینے سے ہاتھ اٹھالو۔ جب کہے آرام کرو تو آرام میں لگ جاؤ اور جب کہے کہ آرام اور نیند چھوڑ کر کام کرو تو نیند اور آرام کو چھوڑ کر کام میں مصروف ہو جاؤ۔

(۳)۔ صبر : مومن کو اللہ کی رضا کے لئے بھوک، پیاس، بے آرامی اور ہر طرح کی مشقتیں جھیلنی پڑتی ہیں۔ اتنی کڑی مہم کی ہمت وہی کر سکتا ہے جس میں صبر اور برداشت کی قوت موجود ہو۔ روزہ اس قوتِ صبر کے پیدا کرنے کا اور ان مشقتوں کا خوگر بنانے کا بہترین ذریعہ ہے۔ روزہ دار پورے ایک مہینے طلوع فجر سے لے کر غروب آفتاب تک بھوک پیاس اور کمزوری کی مشقتیں برداشت کرتا ہے اور شام کو جب وہ روزہ افطار کرکے کچھ آرام کرنا چاہتا ہے تو ہدایت ملتی ہے کہ روزمرہ کی نمازوں کے علاوہ تراویح کی بہت سی رکعات مزید ادا کرے۔ تراویح سے فارغ ہو کر وہ سو جاتا ہے۔ ابھی تھوڑی سی نیند ہو پاتی ہے کہ حکم ملتا ہے سحری کھانے کے لئے اٹھو اور سحری سے فارغ ہو کر نماز فجر کی تیاری میں لگ جاتا ہے۔ شب و روز کا پُر مشقت اور مجاہدانہ پروگرام اسی لئے ہے کہ مردِ مومن اللہ کی راہ میں مشقتیں جھیلنے کا عادی بن جائے

اور اس کے دین پر عمل کرنے، اس کو پھیلانے اور اس کے غالب کرنے کی راہ میں اپنی راحت و آرام کو تج دے اور جو مصیبتیں بھی آئیں انھیں خوشی خوشی انگیز کرے۔

(۴)۔ ہمدردی: روزہ اسلامی معاشرہ میں ہمدردی اور مساوات پیدا کرتا ہے۔ وہ مالداروں کو مسلسل ایک ماہ تک بھوک اور پیاس کا عملی تجربہ کراتا ہے تاکہ انھیں یہ محسوس ہو جائے کہ بھوک کی تکلیف کیسی ہوتی ہے اور ان بندگان خدا کے دل پر کیا گذرتی ہوگی جو ان کے شکار ہوتے ہیں؟ یہ عملی تجربہ اور یہ احساس ان کے اندر یہ عزم پیدا کرتا ہے کہ اپنے غریب اور نادار بھائیوں کو ان کے حال پر نہ چھوڑیں گے۔ اس طرح ان میں انسانی ہمدردی اور انفاق کا جذبہ زیادہ سے زیادہ ابھرتا ہے۔ اسی بنا پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مہینہ کو شَهْرُ الْمُوَاسَاةِ (ہمدردی کا مہینہ) فرمایا ہے۔ اس مہینہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم غریبوں کی دیکھ بھال اور انسانوں کی ہمدردی واعانت کی طرف غیر معمولی توجہ فرماتے تھے اور اہل ایمان کو بھی اس طرف متوجہ کرتے تھے کہ وہ اپنے غریب بھائیوں کی دیکھ بھال اور مدد کی طرف زیادہ توجہ کریں خصوصیت سے غریب روزہ داروں کو افطار کرانے کی آپ نے غیر معمولی فضیلت بیان فرمائی۔ آپ نے فرمایا کہ جو شخص کسی روزہ دار کو افطار کرائے گا اسے اس کے روزے کے اجر کے برابر اجر ملے گا۔ یہ سب ہدایات اسی لئے ہیں کہ اہل ایمان میں انسانوں کے ساتھ ہمدردی اور مواسات کا جذبہ بیدار ہو اور خوشی خوشی دوسرے انسانوں کے کام آئیں۔

(۵) اجتماعیت: فرض روزہ رکھنے کا جو طریقہ بتایا گیا ہے وہ ملی اجتماعیت کو پوری طرح نمایاں کرتا ہے۔ اور مسلمانوں کو یاد دلاتا رہتا ہے کہ تم سب ایک ہی مشن کے علمبردار ہو۔ حکم ہے کہ ایک ہی مقررہ مہینے (رمضان) میں روزے رکھے جائیں۔ ہدایت ہے کہ طلوع فجر سے پہلے سحری کھائی جائے۔ سورج ڈوبتے ہی افطار کر لیا جائے۔ اس

طرح روزہ رکھنے کی شکل یہ بن جاتی ہے کہ سارے کے سارے لوگ ایک ہی مقررہ مہینے میں ایک ساتھ روزہ رکھتے ہیں، تقریباً ایک ہی وقت میں سحری کھاتے ہیں، ایک وقت پر افطار کرتے ہیں، کسی گروہ کے افراد کو ایک ہی مقصد کے حامل اور ایک ہی مہم کے سپاہی ہونے کا احساس دلانے کی یہ کیسی غیر معمولی تدبیر ہے کہ ان کا کھانا پینا ایک ہی ساتھ ہو اور ایک ہی مقصد کے تحت ہو۔

حج

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
مَن حج للہ فلم یرفث ولم یفسق رجع کیومٍ ولدتہ اُمُّہٗ۔ (بخاری ومسلم)	"جس نے اللہ کے لئے حج کیا اور اس دوران اس نے نہ تو کوئی شہوانی حرکت کی نہ کوئی نافرمانی کی وہ جب حج کر کے لوٹتا ہے تو ایسا (پاک) ہو جاتا ہے گویا آج ہی پیدا ہوا ہے۔

تشریح: حج اسلام کے ان پانچ ارکان میں سے ایک اہم رکن ہے جن پر اسلام کی بنیاد قائم ہے اور اسی لئے انھیں ارکان اسلام کہا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔

(۱)۔ اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ (۲) نماز قائم کرنا۔ (۳) زکوٰۃ دینا۔ (۴) رمضان کے روزے رکھنا۔ (۵)۔ اللہ کے گھر کا حج کرنا اگر وہاں جانے کی استطاعت ہو۔

اور قرآن مجید میں ہے کہ لوگوں پر اللہ کے لئے اللہ کے گھر کا حج فرض ہے ان لوگوں پر جو بیت اللہ جانے کی استطاعت رکھتے ہوں۔

حج کی دیگر چار ارکان کے ساتھ اسلام میں اس قدر اہمیت ہے کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں عین اسلام قرار دیا۔ سوال کرنے والے نے آپ سے پوچھا، اسلام کیا ہے؟ آپ نے فرمایا اسلام یہ ہے کہ تم اس بات کی گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو، رمضان کے روزے رکھو اور اگر طاقت رکھتے ہو تو بیت اللہ کا حج کرو۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اگر انسان ان پانچوں چیزوں کا حق ادا کر دے تو اس کی زندگی اسلام کے سانچے میں ڈھل جائے گی اور وہ اللہ کی بندگی کا عمدہ نمونہ بن جائے گا۔"

"حج" کے لغوی معنی زیارت کا ارادہ کرنے کے ہیں۔ شریعت کی زبان میں حج کی عبادت کو حج اس لئے کہا گیا ہے کہ اس میں انسان کعبہ کی زیارت کا ارادہ کرتا ہے اور انسان کعبہ کے سامنے کھڑا ہو کر ایسا محسوس کرتا ہے کہ گویا وہ خود کعبہ کے رب کے سامنے کھڑا ہے۔ طواف اسی حقیقت کا مظہر ہے کہ بندہ اپنے رب کو پا کر پروانہ وار اس کے گرد گھوم رہا ہے اور اس بات کا اعلان کر رہا ہے کہ اس کی پوری زندگی اسی طرح اللہ کی رضاجوئی اور اس کی محبت کے گرد گھومے گی۔ جب وہ ملتزم کو پکڑ کر دعاء کرتا ہے تو اسے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا اُسے اپنے آقا کا دامن ہاتھ آگیا ہے جس سے وہ بیتابانہ لپٹ گیا ہے اور اپنی ساری بات اس سے کہہ دینا چاہتا ہے۔ جب وہ حجر اسود کو چومتا ہے تو اُسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کے ہاتھ میں خدا کا ہاتھ آگیا ہے جسے چوم کر وہ اس سے اس کی بندگی اور رضاجوئی کی بیعت کر رہا ہے۔ اور جب وہ صفا مروہ کے درمیان سعی کرتا ہے تو اس بات کا عملی اعلان کرتا ہے کہ وہ اسی طرح اللہ کے احکام کی بجا آوری اور اس کے دین کی دعوت و اقامت کی راہ میں زندگی بھر دوڑ دھوپ

کرے گا۔ اور جب وہ عرفات کے لق و دق میدان میں اللہ کے حضور توبہ و استغفار کرتا ہے اور اس سے عہد بندگی کرتا ہے اور رو رو کر اس سے دعائیں مانگتا ہے تو وہ اس حقیقت کو اپنے دل و دماغ میں اتارتا ہے کہ اس کے خدا کا کسی سمت اور کسی جگہ سے تعلق نہیں ہے اور اُسے ہر جگہ ہر آن اس کی بندگی میں سرگرم عمل ہونا چاہیئے۔

"حج" کی یہ خصوصیت اس لئے ہے کہ اس کے ادا کرنے کی جگہ ایک ایسا مقام ہے جس کو خدا کے عظیم داعی سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے توحید اور دینی دعوت کا مرکز بنایا تھا جہاں اسلام کی تاریخ ثبت ہے جس کے ہر طرف اس اسلامی انقلاب کے آثار پھیلے ہوئے ہیں جو خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی میں چھٹی صدی عیسوی میں واقع ہوا تھا۔ ان چیزوں نے دیار حرم کو غیر معمولی اہمیت دیدی ہے وہاں ایک قسم کا تاریخی اور نفسیاتی اور دینی ماحول بن گیا ہے۔ جو شخص بھی وہاں جاتا ہے بغیر متأثر ہوئے نہیں رہتا۔

حج کو اسلامی عبادات میں ہمیشہ سے ایک غیر معمولی اہمیت رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جس شخص نے اللہ کے لئے حج کیا اور اس دوران نہ تو کوئی شہوانی حرکت کی نہ (اللہ کی) نافرمانی کا ارتکاب کیا وہ حج کر کے لوٹتا ہے تو ایسا ہوتا ہے گویا آج ہی پیدا ہوا ہے یعنی گناہ سے بالکل پاک ہو جاتا ہے"۔

"حج" ہر اس بالغ مسلمان پر زندگی میں ایک بار فرض ہے جو مکہ معظمہ تک آنے جانے کی قدرت رکھتا ہو۔ اگر کوئی شخص قدرت رکھنے کے باوجود حج نہیں کرتا تو وہ اپنے مسلمان ہونے کو جھٹلاتا ہے۔ ایک موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جسے کسی بیماری نے یا دافعی ضرورت نے یا کسی ظالم حکمران نے روک نہ لیا ہو، اور اس کے باوجود وہ حج نہ کرے تو چاہے ...

برخلاف اس شخص کے بارے میں جس نے اس فریضہ کو صحیح طریقہ سے ادا کر لیا، فرمایا گیا کہ "حج مبرور کا بدلہ جنت کے سوا کچھ نہیں" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کونسا عمل افضل ہے؟ آپ نے فرمایا "اللہ اور اس کے رسول پر ایمان" سوال کیا گیا پھر کونسا عمل بہتر ہے؟ فرمایا "جہاد فی سبیل اللہ" پوچھا گیا پھر کون سا عمل بہتر ہے؟ فرمایا "حج"۔

"حج مبرور" اس حج کو کہتے ہیں جسے حج کی حقیقت۔ حج کی رُوح اور حج کے ظاہری و باطنی محاسن و آداب کو پوری طرح ملحوظ رکھتے ہوئے ادا کیا گیا ہو اور اس طرح اس کا حق ادا کر دیا گیا ہو" ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے حضور نے فرمایا اے عمروؓ کیا تم نہیں جانتے کہ اسلام اپنے سے قبل کے گناہوں کو ڈھا دیتا ہے۔ ہجرت اپنے سے قبل کے گناہوں کو ڈھا دیتی ہے اور حج اپنے قبل کے گناہوں کو ڈھا دیتا ہے"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا "اے اللہ کے رسول! صلی اللہ علیہ وسلم ہم جہاد کو سب اعمال سے افضل خیال کرتے ہیں، تو کیا ہم (عورتیں) جہاد نہ کریں۔؟ آپ نے جواب میں فرمایا "تم عورتوں کے لئے بہترین جہاد حج مبرور ہے"

عرفہ کے دن کی جو حج کا سب سے اہم دن ہوتا ہے فضیلت بیان کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "عرفہ کے دن سے زیادہ اللہ تعالیٰ کسی روز اپنے بندوں کو دوزخ سے رہا نہیں فرماتا وہ (اس روز اپنے بندوں سے زیادہ) قریب ہوتا ہے۔ پھر فرشتوں سے ان کا ذکر مفاخرت کے طور پر کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ (دیکھو تو) یہ (بندے) چاہتے کیا ہیں؟۔

حج کی یہ اہمیت اپنی روح کے اعتبار سے ہے نہ کہ مظاہر کے اعتبار سے۔ دوسرے لفظوں میں محض دیارِ حرم میں جا کر لوٹ آنے کا نام حج نہیں ہے بلکہ ان کیفیات کے حصول کا نام حج ہے جس کے لئے یہ فریضہ مقرر کیا گیا ہے۔ یعنی مومن شرک کے ہر شائبہ سے پاک ہو کر اللہ کا موحد بندہ بنے اور اس کی پرستش، اس کی نیازمندی، اس کی دعائیں، اس کا توکل، اس کی خشیت، اس کی محبت اور اس کی بندگی و اطاعت سب کچھ اللہ تعالیٰ کے لئے ہو۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام شرک کے سب سے بڑے دشمن اور توحید کے سب سے بڑے داعی تھے اور انھوں نے اللہ کے حکم سے خانہ کعبہ کی تعمیر اسی لئے کی تھی کہ وہ اللہ کی توحید کا مرکز بنے اور حج کا فریضہ اسی لئے عائد کیا گیا تھا کہ لوگ ہر سال خانہ کعبہ آکر توحید کا سبق حاصل کریں۔ قرآن مجید میں ہے کہ:

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا وَّ طَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَ الْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۔

(پ۱۷ رکوع ۱۰)

اس واقعہ کو یاد کرو کہ جب ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کو اپنے گھر کی جگہ (تعمیر کے لئے) مقرر فرما دی تھی اس پیغام کیا تھا کہ میرے ساتھ کسی شئے کو شریک نہ بنانا اور میرے گھر کو شرک اور ہر طرح کی گندگیوں سے پاک رکھنا طواف کرنے والوں کے لئے، خانہ کعبہ میں ٹھہرنے والوں کے لئے اور رکوع و سجدہ کرنے والوں کے لئے۔

(۲)۔ مردِ مومن اللہ کی بندگی اور اس کے دین کے لئے یکسو ہو جائے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دوسری اہم ترین صفت قرآن مجید نے یہ بیان کی ہے کہ وہ ہر طرف سے کٹ کر اللہ کی بندگی اور اس کے دین کی پیروی کے لئے یکسو ہو گئے تھے۔ حج کے دوران مردِ مومن عملاً یہی رویہ اختیار کرتا ہے۔ وہ اپنے بال بچوں، اپنے گھر اپنے کاروبار

اور اپنے تمام مشاغل کو چھوڑ کر ایک مدت کے لئے اللہ کی بندگی کے لئے یکسو ہو جاتا ہے یہ اسی حقیقت کو یاد دلانے کے لئے ہے کہ مرد مومن کو اپنی پوری زندگی میں اللہ تعالیٰ کی بندگی واطاعت کے لئے یکسو ہو جانا چاہیئے اور اسے اپنی خواہشات نفس، برادری کے رسم ورواج اور دنیا کے طور وطریق کی پیروی کے بجائے اللہ کے قانون کی پیروی کرنا چاہیئے۔ حج کا ذکر کرتے ہوئے قرآن مجید میں ہے کہ :

حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ۔ (پ ۱۷ رکوع ۱۰)

یہ لوگ اللہ کی بندگی کے لئے یکسو ہوتے ہیں اور انکا دامن شرک کے ہر دھبّہ سے پاک ہوتا ہے۔

(۳)۔ اللہ کی راہ میں ایثار وقربانی : حج کا سفر اللہ کے لئے مشقتیں جھیلنے، زحمتیں اٹھانے اور مال ودولت خرچ کرنے کا سفر ہے، اس سفر میں راحت وآرام رخصت ہو جاتا ہے، عادتیں چھوٹ جاتی ہیں، مستقل طور پر ایک جگہ قیام کرنے کے بجائے آج یہاں کل وہاں، کوچ کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اور بے شمار صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ سب اسی لئے کہ مرد مومن کو یہ بات یاد آئے کہ اسے اسی طرح اللہ کے دین کی پیروی اور اس کے دین کی دعوت واقامت کے لئے وقت اور مال ودولت کی قربانی کرنی چاہیئے۔ راحت وآرام تج دینا چاہیئے اور خطرات ومصائب کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرنا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۂ حج میں حج کے ذکر کے فوراً بعد جہاد کا تذکرہ اور حکم ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کو عورتوں کے لئے جہاد کا قائمقام قرار دیا۔ دیار حرم جا کر اگر حاجیوں کو یہ بات یاد آجائے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام نے اس طرح اللہ کی رضا کے لئے قربانیاں دی تھیں، ابراہیم علیہ السلام نے بڑھاپے میں اپنے اکلوتے بیٹے کو قربان کرنے اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اپنی جان کی قربانی دینے پر آمادہ ہو گئے تھے اور ان دونوں باپ بیٹوں کی پوری زندگی اللہ

کی راہ میں عظیم قربانیوں کی زندگی تھی۔ اور یہ بات یاد آجائے کہ اللہ تعالیٰ کے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے مقدس ساتھیوں نے بے پناہ خطرات و مصائب میں پڑ کر اور عظیم قربانیاں دے کر خانہ کعبہ، دیار عرب اور متمدن دنیا کے بہت بڑے حصے کو شرک و کفر سے پاک کیا تھا۔ اور اپنا خون بہا کر اور اپنی دولت لٹا کر اسلام کے درخت کی آبیاری کی تھی تو دیار حرم سے یہ جذبہ لے کر لوٹے کہ وہ بھی ان مقدس نفوس کے نقش قدم کی پیروی میں اللہ کے دین کی اتباع اور اس کی دعوت و اقامت کی راہ میں ہر طرح کے خطرات و مصائب کا خیر مقدم کریں گے۔ وقت اور جان و مال ہر چیز کی قربانی دیں گے، انسانی حقوق ادا کریں گے۔ خانہ کعبہ جس طرح توحید کا مرکز ہے ٹھیک اسی طرح انسانی حقوق کے تحفظ کا مرکز ہے۔ اسے دنیا میں امن و امان کا مرکز بنایا گیا ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ:

وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا ط (پ رکوع) — اور اس حقیقت کو یاد کرو کہ ہم نے اپنے گھر کو انسانوں کا مرکز موجب امن بنایا۔

یہی وجہ ہے کہ خانہ کعبہ کے آس پاس میلوں تک جنگ ممنوع ہے اور انسان ہی نہیں حیوانات اور نباتات تک کو تحفظ بخشا گیا۔ اور ایام حج یعنی شوال، ذیقعدہ، ذی الحجہ، ان تینوں مہینوں میں جنگ ممنوع قرار دیدی گئی۔ اور حج کی حقیقت میں یہ بات داخل کردی گئی ہے کہ جس طرح حج کے دوران مرد مومن شہوانی باتوں سے بچے گا۔ گناہوں سے اجتناب کریگا اسی طرح وہ انسانی حقوق کا پورا پورا لحاظ رکھے گا اور حق تلفی اور جھگڑے فساد سے انتہائی پرہیز کرے گا۔ قرآن مجید میں ہے:

فَمَنْ فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي — جو شخص ان مہینوں میں حج کی ادائیگی کا ارادہ کرے تو اسے نہ شہوانی بات کرنی چاہیئے نہ نافرمانی کا کوئی کام کرنا چاہئے

اَلْحَجّ ۔ (پ۲ رکوع ۹) اور نہ حج کے دوران کوئی جھگڑا کرنا چاہیئے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ "اللہ حج کے دوران چھوٹی موٹی غلطیوں کو معاف کر دے گا اور حج کو قبول فرمائے گا، بشرطیکہ حاجی نے کسی مسلمان کی آبرو پر کوئی حملہ نہ کیا ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر دین کے بنیادی احکام کو واضح کرتے ہوئے اور امتِ مسلمہ کو آخری نصیحت کرتے ہوئے فرمایا" اے مسلمانو! مسلمانوں کی جان، مال، آبرو تم پر اسی طرح حرام ہے جیسے یہ دن اس مہینہ میں اور اس شہر میں۔

(۴) اجتماعیت: اسلام نے مسلمانوں کو ایک امت بنایا ہے اور حکم دیا ہے کہ وہ اللہ کے دین کی بنیاد پر متحد و متفق ہو جائیں۔ قرآن مجید میں ہے:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا۔ (پ۴ رکوع ۲) اللہ کی رسّی کو اکٹھا ہو کر پکڑ لو اور متفرق نہ ہو جاؤ۔

اسی غرض کے لئے اللہ نے اپنی اور اپنے رسول کی اطاعت کے ساتھ مسلمان حکام کی اطاعت کو فرض قرار دیا ہے بشرطیکہ وہ اللہ کے دین کو قائم اور غالب کریں قرآن مجید میں ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ۔ (پ۵ رکوع ۵) اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے میں سے اولی الامر کی اطاعت کرو۔

مسلمانوں میں دین کی بنیاد پر اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کے لئے اسلام نے عبادات کو بھی اجتماعی طور پر ادا کرنے کا حکم دیا۔ نماز مسجد میں امام کے پیچھے ادا کی جائیگی اور جملہ حرکات و سکنات میں امام کی مکمل اطاعت کی جائے گی۔ روزے رمضان

کے مہینے میں مل جل کر رکھے جائیں گے۔ زکوٰۃ بیت المال میں جمع ہوگی اور نظم و ضبط کے ساتھ صرف کی جائے گی۔ اسی طرح حج میں پوری دنیا سے مسلمان توحید کے مرکز خانہ کعبہ میں اکٹھا ہوتے ہیں اور مل جل کر عبادات بجا لاتے ہیں۔ ان لوگوں میں ہر نسل ہر قوم، ہر ملک، ہر زبان اور ہر حیثیت کے لوگ ہوتے ہیں۔ یہ سب ایک ہی لباس میں ایک ساتھ حج کے مراسم ادا کرتے ہیں۔ یہ اسی لئے کہ انھیں یاد آجائے کہ خدا کی بندگی کے مرکز پر اکٹھا ہو کر ایک اُمت بن جانا ہے اور متحد و متفق ہو کر اللہ کی بندگی کے تقاضے پورے کرنے ہیں۔ کاش، ہم حج سے یہ سبق سیکھ سکتے۔

حسنِ اخلاق

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
ان من خیارکم احسنکم اخلاقا	تم میں سے بہترین آدمی وہ شخص ہے جو
(بخاری و مسلم)	اخلاق میں سب سے بہتر ہو۔

تشریح: اس حدیث میں اس بات کی تعلیم دی گئی ہے کہ مسلمان اپنے اخلاق و عادات کو بہتر سے بہتر بنائے۔ ہر شخص سے نیکی کے ساتھ پیش آئے، خندہ پیشانی سے ملے، بزرگوں کی عزت کرے، چھوٹوں پر شفقت و مہربانی کرے۔ جب بولے نرمی سے بولے، ہر بات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرے۔ کیونکہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اخلاق میں سب لوگوں سے بہتر تھے۔ آپ ہی کی شان میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ یعنی یقیناً تم عظیم اخلاق کے حامل ہو۔ ایک موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا خوش خلقی ایسا عمل ہے جس سے انسان روزہ

رکھنے والے، رات کو عبادت کرنے والے کا درجہ حاصل کرتا ہے، یعنی اچھے اخلاق والا اللہ تعالیٰ کے یہاں وہی درجہ رکھتا ہے جو رات کو عبادت کرنے والوں اور دن کو روزہ رکھنے والوں کا مقرر کیا گیا ہے۔ ایک دوسری حدیث میں فرمایا گیا کہ قیامت کے دن جب اعمال تولے جائیں گے تو سب سے وزن دار عمل حُسن خُلق ہی ہوگا۔ (ترمذی)۔ ان احادیث سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ حُسن خلق کا کیا مقام ہے اور اسلام میں حُسن خلق کتنی ضروری چیز قرار دی گئی ہے۔ یہاں یہ بات سمجھ لینے کی ہے کہ حسن اخلاق کا تعلق انسان کی پوری زندگی سے ہے۔ حُسن اخلاق کا مطلب یہ ہے کہ انسان کسی معاملہ میں بھی بدکرداری، بے اصولے پن اور ناانصافی کا رویہ نہ اختیار کرے، انسانیت، اخلاق، انصاف اور خدا ترسی کو ہر حال میں ملحوظ رکھے اور اپنی پوری زندگی کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا اور آخرت دونوں میں اخلاق اور قوموں کی سربلندی اور کامرانی کا دارومدار اعلیٰ کردار ہی پر ہے، اسی سے دنیا میں عزّت نصیب ہوتی ہے ساکھ قائم ہوتی ہے، لوگوں کے سر احترام سے جھکتے ہیں، بات میں تاثیر پیدا ہوتی ہے دشمن دوست بن جاتے ہیں اور آخرت میں اللہ کی رضا اور جنّت کی دائمی نعمتیں ملتی ہیں۔

عدل وانصاف

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
ان المقسطین عند اللہ علٰی	عدل کرنے والے اللہ کے یہاں نور کے منبر
منابر من نورٍ : الذین یعدلون	پر ہوں گے جو اپنے فیصلوں میں، اپنے گھر والوں
فی حکمھم و اھلیھم و	کے معاملات میں اور ان امور میں جن کے وہ ذمہ دار

مَا وَلُوْا۔ بنائے گئے ہوں انصاف کرتے ہوں۔ (مسلم)

تشریح: عدل وانصاف یہ ہے کہ لوگوں کو ان کا پورا پورا حق دیا جائے۔ عدل و انصاف کا ایک موقع یہ ہے کہ انسان اپنے گھر والوں، اپنے بیوی بچوں اور اپنے اعزا کے ساتھ انصاف کرے اور ان کے حقوق جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں انھیں ٹھیک ٹھیک ادا کرے اور ان کے درمیان کوئی ناروا امتیاز نہ برتے۔

انصاف کا دوسرا موقع یہ ہے کہ جو امور بھی اس کے حوالے کئے جائیں اور جو خدمات بھی اس کے سپرد کی جائیں اُن کا حق ادا کرے اور ان میں عدل و انصاف کے تقاضے پورے کرے۔" انصاف کا تیسرا موقع یہ ہے کہ جب بھی اسے معاملات میں فیصلہ کرنے کا موقع ملے وہ صحیح اور منصفانہ فیصلہ کرے خواہ یہ فیصلہ کرنے کا موقع گھر میں پیش آئے، خاندان، برادری یا قوم میں پیش آئے، کسی اجتماعی ادارے میں پیش آئے یا پنچ، حاکم عدالت یا حاکم و فرمانروا کی حیثیت سے پیش آئے۔ مختصر یہ کہ وہ نہ کسی انسان کا خود حق مارے اور نہ کسی دوسرے انسان کو کسی اور کا حق دلائے۔

انصاف کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ انسان خود اپنے نفس کے ساتھ انصاف کرے اور اسے اس کے حقوق سے محروم نہ کرے جو اسے اللہ نے بخشے ہیں اور نہ اسے اللہ کی نافرمانی پر چلنے دے جس پر چلنے کا نتیجہ دنیا و آخرت دونوں کی تباہی ہے۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ ہر جگہ اور ہر حال میں انصاف کرتے ہیں اور ظلم و ناانصافی سے پوری طرح کنارہ کش رہتے ہیں وہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کے قرب کے سزاوار ہوں گے اور جنّت کی عام نعمتوں کے علاوہ ان کے لئے ایک خصوصی نعمت یہ ہوگی کہ وہ نور کے منبر پر جلوہ افروز ہوں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر حال میں عدل و انصاف پر قائم رہنا اور ظلم و ناانصافی کو

روک کر عدل و انصاف قائم کرنا دنیا کا سب سے مشکل کام ہے ۔ لیکن مومن سے اسی مشکل اور دشوار کام کا مطالبہ کیا گیا ہے ، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ۔ (پ ۱۴ رکوع ۱۸)	یقیناً اللہ تعالیٰ عدل کا ، احسان کا اور عزیزوں کو دینے کا حکم دیتا ہے اور بےحیائی سے بُرے کاموں سے اور دوسرے افراد اور قوموں پر زیادتی و سرکشی کرنے سے منع فرماتا ہے ۔

ایک اور موقع پر فرمایا :

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ج فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ج فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ط اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۔ (پ ۲۶ رکوع ۱۳)	اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں ، تو ان کے درمیان صلح کرادو ، لیکن ان میں سے کوئی گروہ اگر دوسرے گروہ کے خلاف زیادتی کرنے پر تُل جائے تو اس سے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ اللہ کے فیصلہ کی طرف پلٹ آئے ۔ اگر وہ پلٹ آئے تو ان دونوں گروہ کے درمیان انصاف کے ساتھ صلح کرادو اور ہر حال میں انصاف کرو ، یقیناً انصاف کرنے والے اللہ کو محبوب ہیں ۔

انصاف کرنے کا مشکل کام اس وقت اور مشکل ہو جاتا ہے جبکہ انسانوں کو اپنی اولاد ، اپنے والدین اور اپنے اعزا ریا اپنی قوم کے خلاف انصاف کرنا پڑے اور اس انصاف کا فائدہ اس کے مخالفین اور اس کی دشمن قوم کو پہونچ رہا ہو ۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے تمام حالات میں بھی مومن کو انصاف کرنے کا حکم دیا ہے ۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ :

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ط اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى، وَاتَّقُوا اللّٰهَ ط اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ (پ۶ رکوع ۶)

اے ایمان لانے والو! اللہ کیلئے اٹھ کھڑے ہونے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ اور کسی گروہ اور قوم کی عداوت تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کردے کہ تم انصاف نہ کرو۔ ہر حال میں انصاف کرو۔ یہی روش خداترسی سے زیادہ قریب ہے اور خدا سے ڈرو۔ بلاشبہ اللہ ان تمام کاموں سے باخبر ہے جو تم کر رہے ہو۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ج اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝ (پ۵ رکوع ۱۶)

اے ایمان لانے والو! انصاف پر قائم رہنے والے، انصاف کو قائم کرنیوالے اور اللہ کے لئے گواہی دینے والے بنو! خواہ یہ امر خود تمہارے خلاف ہو یا تمہارے والدین یا اعزار کے خلاف ہو۔ اگر کوئی مالدار یا غریب ہو تو اللہ کا اس سے زیادہ تعلق ہے (اور اللہ اسکی خود فکر کریگا) تو تم خواہشات کے پیرو بنکر عدل و انصاف سے نہ ہٹو، لیکن اگر تم نے (گواہی میں) کج بیانی کی یا (عدل و انصاف اور سچی گواہی سے) اعراض کیا تو یقین رکھو کہ اللہ تمہارے کاموں سے باخبر ہے

ان آیات سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ ہر مسلمان اور پوری امتِ مسلمہ کا مقصدِ وجود یہ ہے کہ وہ دنیا میں عدل و انصاف پر قائم، عدل و انصاف کے علم بردار

اور حق وصداقت کے سچے گواہ بن جائیں۔ اگر مسلمانوں نے عدل اور انصاف کے تقاضے پورے نہ کئے اور عدل وانصاف قائم نہ کیا تو انھوں نے اپنے مقصدِ وجود کو ضائع کر دیا اور دنیا وآخرت میں اللہ کی رحمت ونصرت کے مستحق نہ رہے۔ قرآن میں ایک اور مقام پر ہے کہ:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔ (پ ۲۷ رکوع ۱۹)	یقیناً ہم نے اپنے رسول کھلے ہوئے دلائل کے ساتھ بھیجے اور ان کے ساتھ کتاب نازل فرمائی جو (عدل وانصاف کی) ترازو ہے تاکہ لوگ انصاف کو قائم کریں۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ رسولوں کے آنے اور کتابوں کے نازل ہونے کا حقیقی مقصد یہ ہے کہ دُنیا میں عدل وانصاف قائم ہو اور لوگ ایک دوسرے کے حقوق ٹھیک ٹھیک ادا کریں۔

عدل وانصاف کی اسی اہمیت اور فضیلت کے باعث احادیث میں اس کا غیر معمولی اجر بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ تبارک وتعالیٰ سات شخصوں کو اپنے سایہ میں جگہ دے گا جبکہ اس کے سائے کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا۔ عادل[۱] فرمانروا، نوجوان[۲] جو اللہ تعالیٰ کی بندگی واطاعت میں پروان چڑھے، جس شخص[۳] کا دل مسجد میں اٹکا رہے، دو آدمی[۴] جو اللہ کے لئے محبت کرتے ہوں، اسی کے لئے اکٹھے ہوتے ہوں اور اسی کی رضا کے لئے ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہوں، جس شخص[۵] کو کوئی صاحب عزت اور صاحب جمال عورت اپنی طرف دعوت دے اور وہ کہے کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں۔ اور وہ شخص[۶] جو اللہ کی راہ میں خرچ کرے اور اس کے بائیں ہاتھ کو یہ نہ معلوم ہو کہ

داہنے ہاتھ نے کیا خرچ کیا، اور۷ وہ شخص جو تنہائی میں اللہ کو یاد کرے (اور اللہ کے خوف و محبت سے) اس کی آنکھیں بہہ پڑیں۔

اس حدیث میں عادل فرمانروا کا ذکر سب سے پہلے ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عدل کی فضیلت غیر معمولی ہے۔ پھر یہ حقیقت بھی ہے کہ دوسری نیکیاں جن کا ذکر حدیث میں ہے وہ بیشتر انفرادی نوعیت کی ہیں۔ جبکہ عادل فرمانروا کے عدل و انصاف کا تعلق لاکھوں کروڑوں انسانوں سے ہے۔ اور اس کے انصاف کے نتیجہ میں پوری کی پوری قوم امن و سکون اور دنیوی کامرانی پاتی ہے اور خیر و صلاح کے راستہ پر چل کر آخرت کی ابدی کامرانی سے ہمکنار ہوتی ہے۔

عدل کے خلاف ظلم ہے۔ ظلم یہ ہے کہ آپ کسی شخص یا کسی چیز کی حق تلفی کریں۔ جس طرح عدل کی غیر معمولی فضیلت اور غیر معمولی اجر ہے اسی طرح ظلم کا غیر معمولی وبال ہے۔ صحیح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ظلم سے بچو کیونکہ ظلم قیامت کے دن تاریکیوں کی شکل اختیار کرے گا۔ قرآن مجید اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آخرت میں اہلِ ایمان کا نورِ ایمان اور نور کردار محسوس نور کی شکل اختیار کریگا۔ جس کے سہارے وہ بسہولت جنّت کی منازل تک پہونچ سکیں گے اور بلند مراتب پر فائز ہو سکیں گے، منافقین اور کفار و مشرکین اس نور سے محروم ہوں گے اور وہ اندھیروں میں بھٹکتے پھریں گے اور بھٹکتے بھٹکتے جہنم کے اندھیرے کھڈ میں جا گریں گے"۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ظالم کا بھی یہی انجام ہوگا۔ اس نے جس قدر حق تلفیاں کی ہونگی اسی قدر وہ تاریکیوں میں گھرا ہوگا اور ان تاریکیوں میں بھٹکتا ہوا جہنم میں جا گرے گا۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص کسی کی ایک بالشت بھر زمین ظلم سے چھین لے تو اس کی گردن میں سات زمین کا طوق ڈالا جائے گا۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " اللہ تعالیٰ ظالم کو مہلت دیتا ہے۔ پھر جب اس کو پکڑتا ہے تو نہیں چھوڑتا ، پھر آپ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی

وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ ۭ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ ۔ (پ۱۲ رکوع ۹)

ایسی ہی تیرے رب کی پکڑ ہے جب وہ کسی بستی کو ظلم کرتے ہوئے پکڑتا ہے ، بیشک اس کی پکڑ بڑی سخت اور دکھ دینے والی ہے ۔

صحیح حدیث میں ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کے ذمہ اپنے بھائی کی کوئی ایسی چیز ہو جو ظلم سے اس نے لی ہو ، اس کی بے عزتی کی ہو یا کوئی اور چیز ہو اس کو لازم ہے کہ دُنیا میں اُس سے معاف کرالے اور اپنے ذمہ کو اس سے بری کرلے اس سے پہلے کہ اس کے پاس نہ دینار ہوگا نہ درہم ۔ اگر اس کے عمل صالح ہوں گے تو لوگوں کے حقوق کے بدلہ میں اس کے اچھے اعمال انھیں دیئے جائیں گے اور اگر اعمال صالحہ نہ ہوں گے تو حقدار کے گناہ اس پر ڈال دیئے جائیں گے ۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا جو شخص کسی مسلمان کا حق جھوٹی قسم کھا کر حاصل کرے گا اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے دوزخ کی آگ واجب کردی ہے اور جنت اس پر حرام کر دی ہے ۔ ایک شخص نے کہا اے رسول اگرچہ تھوڑی چیز ہو ؟ آپ نے فرمایا اگرچہ پیلو کے درخت کی ٹہنی ہی ہو ۔

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے دریافت فرمایا کیا تم جانتے ہو کہ دیوالیہ کون ہے ؟ لوگوں نے کہا کہ ہم میں دیوالیہ وہ ہے جس کے پاس نہ روپیہ ہو اور نہ مال ومتاع ۔ آپ نے فرمایا میری امت میں سے قیامت کے دن وہ شخص دیوالیہ ہوگا جس نے دُنیا میں نماز پڑھی ہو ، روزے رکھے ہوں ، زکوٰۃ ادا کی ہو مگر کسی کو گالی دی ہوگی ، کسی کو تہمت لگائی ہوگی اور کسی کا مال کھایا

ہوگا اور کسی کا خون بہایا ہوگا، کسی کو مارا ہوگا، اس کی نیکیاں ان کو دیدی جائیں گی، اگر اس کے نیک اعمال لوگوں کے حقوق ادا کرنے سے پہلے ہی تمام ہوگئے تو ان کے گناہ اس کے سر ڈال کر دوزخ کی آگ میں ڈال دیا جائے گا۔"

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تمہارے جیسا آدمی ہوں اور تم میرے پاس جھگڑے فیصلہ کرانے کو لاتے ہو، اور شاید تم میں سے کوئی اپنے دعوے کے ثبوت میں اپنے زورِ بیان کے باعث زیادہ عمدہ بحث کرے اور میں اس کا بیان سُن کر اُس کے حق میں فیصلہ کر دوں۔ اس طرح جس شخص کو مَیں (غلطی سے) دوسرے کا حق دلوا دوں تو فی الواقع وہ جہنم کی آگ کا ایک ٹکڑا ہے جو مَیں اسے دِلوا رہا ہوں۔"

ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے فرمایا "مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم ہر دن روزہ رکھتے ہو اور رات بھر نماز پڑھتے ہو۔ انھوں نے کہا ہاں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم یہ بات صحیح ہے۔ آپ نے فرمایا ایسا نہ کرو، نفل روزہ بھی رکھو اور بے روزہ بھی رہو، رات کو سو بھی رہو اور اُٹھ کر نفل نماز بھی پڑھو، کیونکہ تمہارے بدن کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری آنکھوں کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے اور تمہارے مہمانوں کا بھی تم پر حق ہے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ تمہاری اولاد کا بھی تم پر حق ہے۔"

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عبادت گذاری میں غلو بھی ظلم ہے۔ حقیقی دینداری یہ ہے کہ انسان اللہ کا حق ادا کرنے کے ساتھ اپنے بدن، اپنے بیوی بچوں، اپنے دوست و احباب اور مہمانوں کے جائز حقوق بھی ادا کرے۔

قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے نفس کی سب سے بڑی حق تلفی یہ ہے کہ انسان اسے اللہ کی نافرمانی کے کام کرنے دے کیونکہ اس صورت میں اسے دُنیا و

آخرت کی ہولناک تباہی سے دوچار ہونا پڑے گا۔قرآن مجید میں ظلم کا لفظ عام طور پر اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔قرآن مجید میں ایک موقع پر ہے کہ:

وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ۔ (پ رکوع)
اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ (اللہ کی نافرمانی کرکے) خود اپنے اوپر ظلم کرتے تھے۔

مومنین کی دعاء کا تذکرہ کرتے ہوئے قرآن نے فرمایا:

رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔ (پ رکوع ۱)۔
اے ہمارے رب ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو ہمیں نہ بخشے گا اور نہ ہم پر تو رحم کرے گا تو یقیناً ہم ٹوٹا اور خسارہ پانے والوں میں سے ہو جائینگے

اور شرک چونکہ اللہ کی سب سے بڑی نافرمانی ہے اسی لئے قرآن مجید میں اس کو ظلم عظیم یعنی سب سے بڑا ظلم قرار دیا گیا ہے۔

احادیث میں بھی ظلم کا لفظ اسی معنی میں آتا ہے۔نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نماز کے آخر میں جو دعاء پڑھنے کی تلقین کی تھی وہ یہ تھی:

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ ظُلْمًا كَثِيْرًا وَّلَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ فَاغْفِرْ لِيْ مَغْفِرَةً مِّنْ عِنْدِكَ وَارْحَمْنِيْ اِنَّكَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ۔
اے اللہ میں نے اپنی جان پر بڑا ہی ظلم کیا اور تیرے سوا کوئی اور گناہوں کو نہیں بخش سکتا۔تو مجھ کو اپنی خاص بخشش سے بخش دے اور مجھ پر رحم کر۔بیشک تو بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

صبر

قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَیْسَ مِنَّا مَنْ ضَرَبَ الْخُدُوْدَ وَ شَقَّ — جو کوئی (مصیبت کے وقت) اپنے منھ کو پیٹے اور گریبان

الْجُیُوْبَ وَدَعَا بِدَعْوَی الْجَاھِلِیَّۃِ (بخاری) — پھاڑے اور جاہلیت کی پکار لگائے وہ ہم میں سے نہیں ہے

تشریح: دنیا میں وہ کونسا انسان ہے جو ہمیشہ خوش و خرم رہا ہو۔ مصیبت، تکلیف، دکھ، درد انسان ہی کے لئے ہے۔ انسان کی حالت کبھی یکساں نہیں رہتی۔ آج کچھ ہے تو کل کچھ۔ تھوڑی تھوڑی مصیبت پر آپے سے باہر ہو جانا اور صبر کے دامن کو ہاتھ سے چھوڑ دینا انسانیت کے خلاف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دنیا امتحان اور آزمائش کی جگہ ہے اور یہاں اللہ تعالیٰ انسان کا امتحان نعمتیں دیکر بھی لیتا ہے اور نعمتیں واپس لے کر بھی۔ جو شخص نعمتیں پاکر خدا کو بھول جاتا ہے اور آپے سے باہر ہو کر بندوں کی حق تلفی پر تُل جاتا ہے وہ اللہ کے امتحان میں ناکام ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جو شخص نعمتوں کے چھن جانے پر صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتا ہے اور زبان یا اپنی حرکات سے اللہ کی ناشکری اور نافرمانی کا مظاہرہ کرتا ہے وہ بھی اس کے امتحان میں فیل ہو جاتا ہے۔ مومن اس حقیقت کو خوب جانتا ہے۔ وہ نعمتیں پاکر آپے سے باہر نہیں ہوتا اور نہ نعمتیں کھو کر بدحواس ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مومن کا معاملہ بڑا عجیب ہے۔ ہر حال میں اس کے لئے بھلائی ہی بھلائی اور کامیابی ہی کامیابی ہے۔ جب اسے کوئی نعمت ملتی ہے تو وہ اللہ کا شکر ادا کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے اور یہ بات اس کے موجب خیر ہوتی ہے اور جب اس پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ صبر کا راستہ اختیار کرتا ہے اور یہ بھی اس

کے لئے موجب خیر ہوتا ہے۔ بات صرف اتنی ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ اپنے مومن اور وفادار بندوں کا مصائب ومشکلات کے ذریعہ امتحان لیتا ہے اور انھیں اسی وقت مومن ووفادار ہونے کا سرٹیفکیٹ عطا فرماتا ہے جب وہ آزمائشوں کی بھٹی سے کھرا سونا بن کر برآمد ہو۔ اسی وقت اللہ تعالیٰ کی مدد ان کے شامل حال ہوتی ہے اور مومن آخرت میں اس کی رحمت اور جنت کے مستحق ہوتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ○ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ ○ (پ ۲ رکوع ۳)	ہم تمہیں ضرور آزمائیں گے کچھ خوف سے کچھ بھوک اور مال وجان، پیداوار کی کچھ کمی سے۔ اور ان لوگوں کو خوش خبری دو جوان حالات میں صبر اختیار کریں۔ یہ وہ لوگ ہیں جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو کہہ اٹھتے ہیں کہ ہم سب اللہ ہی کے لئے ہیں اور ہم سب کو اسی کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔ ایسے ہی لوگوں پر ان کا رب رحمتوں اور برکتوں کی بارش فرماتا ہے اور ایسے ہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُم مَّثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلِكُم ۖ مَّسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوا	کیا تمہارا خیال یہ ہے کہ جنت میں (ٹھنڈے ٹھنڈے) داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تم پر وہ آزمائشیں نہیں آئیں جو تم سے پہلے گئے لوگوں پر آئی تھیں۔ وہ فقر وفاقہ سے دوچار ہوئے

حَتّٰی یَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰی نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ ○ (پ ۲ رکوع ۱۰)

مصیبتوں میں مبتلا ہوئے (اور مخالفین کی مخالفتوں سے) ہلا ڈالے گئے۔ یہاں تک کہ رسول اور اس کے ساتھ اہل ایمان نے کہا اللہ کی مدد کب آئیگی؟ سنو! اللہ کی مدد قریب ہے۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ دنیا میں اللہ کی مدد اور آخرت کی نجات دونوں کا دارومدار اس بات پر ہے کہ انسان صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے اور مصائب و مشکلات کے ہجوم میں اللہ کی رضا اور دین حق پر قائم رہے۔

مصائب و مشکلات کا ایک اور پہلو ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ انسان کی تربیت کرتے ہیں اور اس کی سیرت کی تعمیر میں غیر معمولی مدد دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اللہ کو زیادہ پیارے ہوتے ہیں اُن پر مصائب و مشکلات زیادہ آتے ہیں۔ ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی سیرت کو پختہ تر کرنا چاہتا ہے۔ ان کی خامیوں کو ایک ایک کرکے دُور کرنا چاہتا ہے اور اُنھیں پاک و صاف کرکے اپنا مقرب بندہ بنانا چاہتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ تعالیٰ جس بندے کو خیر سے نوازنا چاہتا ہے اس پر مصیبت نازل فرماتا ہے"۔

ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا جتنی بڑی مصیبت ہوگی اتنا ہی بڑا اجر ہوگا اور جب اللہ تعالیٰ کسی گروہ سے محبت رکھتا ہے تو اس کا امتحان لیتا ہے۔ تو جو کوئی راضی ہوتا ہے اللہ بھی اس سے راضی ہوتا ہے اور جو کوئی ناراض ہوتا ہے اس کے حصہ میں ناراضگی آتی ہے"۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مسلمان کو جو تکلیف۔ بیماری۔ فکر و غم، دُکھ درد اور مصیبت پہونچتی ہے یہاں تک کہ جو کانٹا

اس کو لگتا ہے ان سب کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو دور فرما دیتا ہے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مومن مرد اور مومنہ عورت پر ان کی جان، اولاد، اور مال و دولت میں آزمائشیں اور مصیبتیں آتی رہتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ جب اللہ سے ملتا ہے تو اس کی زندگی گناہوں سے بالکل پاک ہو چکی ہوتی ہے۔ یہ ہے مصائب و مشکلات کے سلسلہ میں اللہ کی حکمت۔ اور جس مومن کی اس حکمت پر نظر ہو گی وہ مصائب و مشکلات میں خوشی خوشی صبر کا راستہ اختیار کرے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ انسان کو صبر سے بڑھ کر کوئی چیز ہی نہیں بخشی گئی۔ مومن کی نشان یہ ہے کہ اگر اسے خوشحالی اور فراخی نصیب ہو تو شکر کرے۔ یہ شکر گذاری اس کے حق میں بہتر ہو گی اگر مصیبت پہونچے اور اس میں صبر کرے تو اس کے حق میں یہ بہتر ہو گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے " اے ابن آدم! اگر تو ابتداءً کسی صدمہ کے وقت صبر کرے اور ثواب کی امید رکھے تو میں تجھ کو اس کے بدلہ میں جنت ہی دے کر خوش ہوں گا۔ یعنی کسی مصیبت کا پہلے پہل حملہ ہو اور وہ اس کو برداشت کر لے۔ ورنہ رونے اور جزع و فزع کرنے کے بعد تو صبر آ ہی جاتا ہے۔ خوش ہونے کا مطلب یہ ہے کہ میں جب ہی خوش ہوں گا جب تجھ کو جنت میں داخل کر دوں گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اپنے بندے کی دو پیاری چیزیں لے کر اس کو امتحان میں مبتلا کرتا ہوں اور وہ صبر کرتا ہے تو ان دونوں پیاری چیزوں کے بدلہ میں میں اس کو جنت عطا کرتا ہوں (پیاری چیزوں سے مراد آنکھیں ہیں)۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب کسی بندے کا لڑکا مرجاتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے دریافت کرتا ہے کہ تم نے میرے بندے کے بچے کی روح قبض کی؟ فرشتے اثبات میں جواب دیتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے کہ اس پر میرے بندے نے کیا کہا؟ فرشتے عرض کرتے ہیں تیرے بندے نے تیری تعریف کی اور اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے اس بندے کے لئے جنت میں ایک گھر بنا دو اور اس کا نام بَیْتُ الْحَمْدِ رکھو۔

اسلام میں صبر کے معنی بہت وسیع ہیں۔ اپنے جذبات اور خواہشات کو قابو میں رکھنا بھی صبر ہے۔ جلد بازی اور گھبراہٹ سے کام نہ لینا صبر ہے۔ کسی خوف یا لالچ کے موقع پر راہِ حق سے نہ ہٹنا صبر ہے۔ ٹھنڈے دل سے جنچی تلی قوت فیصلہ سے کام لینا اور بے جا جوش سے بچنا صبر ہے۔ کیسے ہی اندیشے اور مشکلات سامنے ہوں اس کے باوجود قدم راہِ حق سے نہ ڈگمگائے یہ صبر ہے۔ مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹے، حالات بگڑتے نظر آئیں تو ایسی حالت میں بے چین نہ ہونا اور حواس کو پریشان نہ ہونے دینا صبر ہے۔ غصہ کے وقت اپنے کو قابو میں رکھنا صبر ہے۔ کسی مقصد کے حاصل کرنے کے شوق میں جلد بازی سے بچنا صبر ہے۔ دنیوی فائدے نفس کی لذتیں اور طرح طرح کی رنگینیاں جب دل کو لبھائیں تو اُن کے مقابلہ میں صحیح راستہ پر قائم رہنا اور کوئی غلط قدم نہ اٹھانا صبر ہے۔ اللہ کی رضا اور دینِ حق کی اقامت کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینا صبر ہے اور میدان جنگ میں جہاں موت سروں پر منڈلا رہی ہو باطل کا مردانہ وار مقابلہ کرنا اور سینے پر چوٹ کھانا صبر ہے۔

بندہ مومن سے اللہ تعالیٰ کا مطالبہ یہ ہے کہ وہ صبر کے ان تمام پہلوؤں کے

لحاظ سے اللہ کا صابر بندہ بنے۔ جب بندہ اللہ کے اس مطالبہ کو کما حقہٗ پورا کر دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ دنیا میں اس کا ساتھ دیتا ہے اور آخرت میں اس پر اپنی بے پایاں اور ابدی نعمتوں کی بارش فرماتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ۝ (پ۲ رکوع ۳)

اے ایمان لانے والو! صبر اور نماز سے مدد لو۔ اور یقین رکھو کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

ایک اور موقع پر اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ ۝ (پ۲۳ رکوع ۱۶)

صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے حد و حساب ملے گا۔

غرض یہ کہ قرآن مجید میں جس طرح پر اس لفظ کا استعمال کیا گیا ہے اس کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس لفظ میں بہت سے معنی سمیٹ دیئے گئے ہیں۔ اب ذرا سوچئے کہ ایک بندۂ مومن ان تمام موقعوں پر جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے اپنے نفس کو قابو میں رکھتا ہے اور کوئی غلط قدم نہیں اٹھاتا تو یقیناً وہ ایک بڑا کام کرتا ہے اور اسے اس کا ایسا ہی اجر ملنا چاہیئے۔

شکر

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَجَبًا لِاَمْرِ الْمُؤْمِنِ اِنَّ اَمْرَهٗ كُلَّهٗ لَهٗ خَيْرٌ وَّلَيْسَ ذٰلِكَ لِاَحَدٍ اِلَّا لِلْمُؤْمِنِ اِنْ اَصَابَتْهُ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ مومن کا عجیب حال ہے۔ اس کا ہر حال اس کے لئے بہتر ہے اور یہ بات بجز مومن کے اور کسی کو حاصل نہیں۔ اگر اس کو کوئی نعمت

سَرَّاءُ شَكَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ
وَإِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ صَبَرَ
فَكَانَ خَيْرًا لَهُ۔ (مسلم)

ملتی ہے تو شکر کرتا ہے اور یہ اس کے لئے بہتر ہوتا ہے اور اگر اس کو کوئی تکلیف پہونچتی ہے تو وہ اس پر صبر کرتا ہے اور یہ اس کیلئے بہتر ہوتا ہے

تشریح: اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی وضاحت فرمائی ہے کہ مومن کے لئے خواہ خوشی کا موقع ہو یا غم کا، ہر حال میں کامیابی ہی کامیابی ہے نعمتیں پانے پر وہ اللہ کا شکر ادا کرتا ہے اور شکر ادا کرنے کے نتیجہ میں دُنیا و آخرت دونوں میں اس کی رحمتوں کا مستحق ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی مصیبت پہونچتی ہے تو وہ صبر اختیار کرتا ہے اور صبر کے نتیجہ میں وہ دنیا و آخرت دونوں میں اللہ کی رحمتوں کا مستحق ہوتا ہے۔ اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شکر اور صبر دونوں کی فضیلت بیان کی ہے۔ صبر کے بارے میں اس سے پہلے تفصیل بیان کی گئی ہے۔ یہاں ہم صرف شکر کی تشریح بیان کریں گے۔

شکر کے معنی یہ ہیں کہ آپ دل سے کسی کے احسان کو مانیں، اس کے احسان مند ہو کر دل میں اس کی محبت کو جگہ دیں، زبان سے اس کے لطف و کرم کا تذکرہ کریں اور عمل سے یہ ثبوت دیں کہ آپ احسان فراموش اور ناشکرے نہیں ہیں۔

انسان پر سب سے بڑا احسان اللہ تعالیٰ کا ہے اور حقیقی محسن وہی ہے جو کچھ ملتا ہے اسی سے ملتا ہے اسی نے انسانوں کو وجود بخشا، وہی زندگی کی ساری ضروریات فراہم کرتا ہے، اسی کے کرم سے وہ تمام بے شمار انتظامات ہو رہے ہیں جن میں سے اگر ایک بھی نہ ہوتا تو انسان کا جینا ہی ممکن نہ ہوتا۔ انسان ذرا آنکھ کھول کر دیکھے اور غور کرے تو اسے محسوس ہوگا کہ اس کا رونگٹا رونگٹا اللہ تعالیٰ کے احسان میں جکڑا ہوا ہے۔ ہر سانس جو اندر جاتا ہے زندگی کے لئے تازگی فراہم کرتا ہے اور اس پر ایک

شکر واجب ہو جاتا ہے۔ اور ہر سانس جب باہر آتا ہے زندگی کو برقرار رکھنے کا سبب بنتا ہے اور اس پر بھی شکر ادا کرنا چاہیئے، اسی طرح ہر ہر سانس ہم سے احسان مندی کا مطالبہ کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ سانس لینے والی اس ہوا کے علاوہ کتنی اَن گنت نعمتیں ہیں جن سے ہم ہر لمحہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ انسان کی مجال نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احسانات کا شمار کر سکے۔ قرآن مجید میں ہے:

وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ط	اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرو تو تم ان کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ (پ ۱۴ رکوع ۸)

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے مقابلے میں بندے کی طرف سے کم سے کم جو رویہ ہونا چاہیئے اسے ہر وقت سامنے رکھیئے۔ جو دل اللہ تعالیٰ کی احسان مندی کے جذبہ سے خالی ہے وہ کبھی ایمان پر جم نہیں سکتا۔ اور جس بندے کو اپنے آقا کے احسانات کا احساس نہیں ہے وہ کبھی اس کی وفاداری پر قائم نہیں رہ سکتا۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم دل سے اللہ تعالیٰ کے احسانات کو مانیں۔ یہ یقین رکھیں کہ اصل کرم کرنے والا صرف وہی ہے کسی دوسرے کو یہ اختیار ہی کہاں ہے کہ وہ کسی پر کچھ کرم کر سکے۔ بظاہر اگر ہمیں کوئی چیز کسی دوسرے کی طرف سے پہونچتی ہے تو دراصل یہ بھی اللہ تعالیٰ کی منشاء اور اس کے حکم سے ہی پہونچتی ہے۔ اس کے علاوہ جو کوئی ہے وہ محض ایک ذریعہ ہے۔ ہر نعمت اسی کی طرف سے ہے، جو کچھ مل رہا ہے اسی کی دین ہے، اس کے علاوہ نہ کوئی محسن ہے نہ کوئی منعم۔ ہر طرح کے شکر کے لائق صرف وہی ہے۔ ہم پر احسانات کی بارش کرنے میں کوئی اس کا شریک نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے دل میں محبت اور وفاداری کا جذبہ صرف اللہ کے لیئے ہو۔ یہ بات پہلی بات کا لازمی تقاضا ہے۔ اگر ہم صحیح طریقہ پر محسوس کر لیں کہ

ہمارا حقیقی محسن اللہ ہے تو پھر اس کا لازمی تقاضا یہی ہوگا کہ ہمارے دل میں محبت بھی اسی کی پیدا ہو۔ اور ہم ہر حال میں اسی کی وفاداری کا دم بھریں۔ یہ کھلی ہوئی نمک حرامی ہوگی کہ ہمارا محسن حقیقی تو کوئی اور ہو اور ہماری محبت اور وفاداریوں کا مرکز کوئی دوسرا بن جائے۔ خاص طور پر نظر رکھنا پڑے گی کہ کہیں اللہ کے مخالفوں سے آپ کا تعلق محبت وخلوص کا تو نہیں ہے دل کے اس چور پر بڑی سخت نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ زبان پر اللہ کے شکر کے کلمے جاری رہتے ہیں لیکن محبت وخلوص کا برتاؤ اللہ کے دشمنوں سے ہوتا رہتا ہے اور ان کی وفاداری کا دم بھرا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ	اے نبی! جو لوگ اللہ اور آخرت پر یقین رکھتے
وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ	ہیں تم اسے اللہ اور اس کے رسول کے دشمنوں
حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا	سے دوستی کرتا ہوا نہ پاؤ گے۔ اگرچہ یہ لوگ
اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ	ان کے باپ، ان کے بیٹے، ان کے بھائی بند
اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ط (پ ۲۸ رکوع ۳)	اور خاندان والے ہی کیوں نہ ہوں۔

ایک اور مقام پر ہے:

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ	اے اہل ایمان! اہل کفر کو اللہ
اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ج	کے سوا اپنا دوست نہ بنائیں۔ اور جو ایسا
وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ	کرے گا اس کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں۔
اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ	الّا یہ کہ تم ان کے فتنوں سے بچنے کے لئے
تُقٰىةً ط (پ ۳ رکوع ۱۱)	کوئی روش اختیار کرو۔

تیسری اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ ہمارا محسن حقیقی ہے اور

ہمارے پاس جسم و جان، اعضاء و جوارح، صلاحیتیں اور قوتیں، مال و اسباب اور وسائل و ذرائع کی صورت میں جو کچھ ہے وہ سب اسی کا بخشا ہوا ہے اور ہماری پوری زندگی اور اس کا ایک ایک لمحہ اس کی دین ہے۔ تو اللہ کے شکر کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی دی ہوئی نعمتوں کو والہانہ اس کی رضا میں لگا دیں۔ اور اس کی بخشی ہوئی چیزوں سے کوئی ایسا کام نہ لیں جو اس کی مرضی کے خلاف ہو۔ کسی محسن کی حقیقی احسان شناسی تو یہ ہے کہ ہم اس کے احسانات کا پورا پورا بدلہ دیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے اور ہمارے پاس کوئی چیز اپنی ہے ہی نہیں جو ہم اس کے احسانات کے بدلہ میں اسے دے سکیں۔ ہم زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں اور یہ اس کے احسانات کا کم سے کم حق ہے کہ اس کی بخشی ہوئی نعمتوں کو اس کی مرضی کے مطابق استعمال کریں اور جان و مال اور صلاحیتوں اور قوتوں کو اس کی راہ میں لگا دیں۔

اگر ہم شکر کا رویہ اختیار کریں گے تو دنیا اور آخرت دونوں میں اللہ تعالیٰ ہم پر بے شمار نعمتوں کی بارش فرمائے گا۔ اس کے برعکس اگر ہم ناشکری کا رویہ اختیار کریں گے اور اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو اس کی نافرمانی یا اس کے دشمنوں کی وفاداری میں صرف کریں گے تو دنیا و آخرت دونوں میں اس کے شدید عذاب کے مستحق ہوں گے۔ قرآن مجید میں ہے:

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ۔ (پ (ابراہیم))	اور تمہارے رب نے اس بات کا اعلان کر دیا ہے کہ اگر تم شکر ادا کرو گے تو میں یقیناً تمہیں مزید دوں گا اور اگر تم میری ناشکری کرو گے تو تم میرے عذاب سے دوچار ہو گے اور یہ حقیقت ہے کہ میرا عذاب بہت سخت ہے

قرآن مجید میں ایک کھاتی پیتی فارغ البال بستی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ:

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً	اور اللہ ایک بستی کی مثال بیان فرماتا ہے کہ بستی والے
كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا	امن واطمینان کی زندگی بسر کر رہے تھے اور ہر طرح سے
رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ	ان کو بفراغت رزق پہونچ رہا تھا کہ انھوں نے اللہ
فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا	کی نعمتوں کی ناشکری کی۔ تب اللہ نے اس
اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ	کے باشندوں کو ان کے کرتوتوں کا یہ مزا چکھایا
بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۝ وَلَقَدْ	کہ بھوک اور خوف کی مصیبتیں ان پر چھا گئیں۔
جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوْهُ	ان کے پاس ان کی اپنی قوم میں سے ایک رسول
فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَهُمْ	آیا مگر انھوں نے اس کو جھٹلایا، آخر کار عذاب نے
ظٰلِمُوْنَ ۝ فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ	ان کو پکڑ لیا جبکہ وہ ظالم ہو چکے تھے۔ اس لئے
اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّاشْكُرُوْا	اے لوگو! اللہ نے جو حلال اور پاک رزق تم کو
نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ	بخشا ہے اسے کھاؤ اور اللہ کے احسان کا شکر ادا کرو
تَعْبُدُوْنَ ۝ (پ۱۴ رکوع ۲۰)	اگر تم واقعی اسی کی بندگی کرنے والے ہو۔"

اسی طرح ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرماتے تھے" بنی اسرائیل میں تین آدمی تھے ایک کوڑھی، دوسرا گنجا، تیسرا اندھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا امتحان کا ارادہ کرکے ان کے پاس ایک فرشتہ (مسکین اور فقیر کی صورت میں تاکہ لوگوں کو ظاہر نہ ہو) بھیجا۔ سب سے پہلے اس کوڑھی کے پاس آکر کہنے لگا تجھے سب سے زیادہ کیا پسند ہے ؟ وہ بولا میرا رنگ اچھا ہو جائے اور بدن کی کھال اچھی ہو جائے اور میری حالت کہ جس سے لوگ گھن کھاتے ہیں جاتی رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اس پر فرشتے نے ہاتھ پھیر دیا۔ اس کی تمام بیماری جاتی رہی اور اچھا رنگ اور عمدہ کھال بدن کی اسے دیدی

گئی پھر اس سے پوچھا گیا کہ تجھے کون سا مال زیادہ پسند ہے؟ وہ بولا اونٹ یا بولا گائیں (اسحاق راوی کو شک ہے) ہاں یہ بات ضرور ہے کہ کوڑھی اور گنجے میں سے ایک نے اونٹ کہا تھا اور ایک نے گائیں۔ شک فقط تعیین میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسے دس مہینے کی حاملہ اونٹنیاں دے کر کہدیا کہ اللہ تجھے ان میں برکت دے: آپ فرماتے ہیں کہ پھر یہ فرشتہ گنجے کے پاس گیا اور کہا کہ تجھے کون سی چیز پیاری ہے؟ وہ بولا میرے اچھے بال نکل آئیں اور مجھ سے جو لوگ گھن کرتے ہیں یہ جاتی رہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ فرشتے نے اس پر بھی ہاتھ پھیر دیا اور اس سے سب گھن جاتی رہی اور اچھے عمدہ بال دیدیئے گئے اور پھر اس سے پوچھا کہ تجھے کون سا مال زیادہ مرغوب ہے؟ وہ بولا گائیں۔ اُسے گابھن گائیں دیدی گئیں اور یہ کہدیا کہ اللہ تجھے ان میں برکت دے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ پھر یہ فرشتہ اس اندھے کے پاس گیا اور اس سے پوچھا کہ تجھے کیا چیز پیاری ہے، وہ بولا کہ مجھے اللہ تعالیٰ میری بینائی دیدے اور میں لوگوں کو دیکھنے لگوں! آپ فرماتے ہیں کہ فرشتے نے اس پر بھی ہاتھ پھیر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی بینائی اسے دیدی، پھر پوچھا کہ تجھے کونسا مال پسند ہے؟ وہ بولا بکریاں، چنانچہ اسے بہت بچے دینے والی بکریاں دیدی گئیں اور پھر انھوں نے اور سب نے بچے دیئے اور کوڑھی کے لئے ایک جنگل اونٹوں کا بھر گیا اور گنجے کے لئے گایوں کا اور اندھے کے لئے بکریوں کا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ پھر وہی فرشتہ اپنی اسی شکل وصورت میں کوڑھی کے پاس آکر کہنے لگا کہ میں مسکین آدمی ہوں، میرا سب اسباب سفر میں جاتا رہا اور آج میں بجز عنایت خداوندی کے اپنے مطلب کو نہیں پہونچ سکتا اور تجھ سے بوسیلہ اس ذات کے جس نے تجھے اچھا رنگ اور عمدہ کھال عطا کی اور مال دیا ایک اونٹ

مانگتا ہوں تاکہ اس سفر میں مجھے کفایت کرے ۔ وہ بولا میاں میرے ذمّہ تو بڑے حق ہیں ۔ فرشتے نے کہا " میں تو شاید تجھے پہچانتا ہوں ، کیا تو کوڑھی نقیر نہ تھا کہ تجھ سے لوگ بھی گھن کرتے تھے اب تجھے اللہ نے یہ دولت دیدی ہے ؟ وہ بولا نہیں ، یہ مال تو مجھے وراثت میں میرے بڑوں سے پہونچا ہے ۔ فرشتے نے کہا اگر تو جھوٹا ہو تو خدا تجھے پھر ویسا ہی کر دے ۔ پھر فرشتے نے اپنی اسی صورت میں آکر اسی طرح گنجے سے کہا ، اس نے بھی اُسے کوڑھی کی طرح جواب دیا ۔ فرشتے نے کہا اگر تو بھی جھوٹا ہو تو خدا تجھے پھر ویسا ہی کر دے ۔ پھر یہ فرشتہ اپنی اسی صورت و شکل میں اندھے کے پاس آیا اور کہا کہ میں مسکین آدمی مسافر ہوں ۔ میرا سب سامان سفر میں جاتا رہا اور آج بجز عنایتِ خداوندی کے اپنے مطلب کو نہیں پہونچ سکتا اور تجھ سے بوسیلہ اسی ذات کے جس نے تجھے پھر بینائی دی ایک بکری مانگتا ہوں تاکہ اس کے سبب سے مَیں سفر میں اپنے مطلب کو پہونچوں ۔ وہ بولا واقعی میں اندھا تھا اور اللہ تعالیٰ نے میری بینائی مجھے پھر دیدی ، اب تُو جو کچھ چاہے لے جا اور جو کچھ چاہے چھوڑ جا ۔ مجھے کچھ انکار نہیں ہے قسم ہے خدا کی جو چیز بھی تُو واسطے اللہ کے لے گا میں تجھے ہرگز نہیں روکوں گا ۔ فرشتے نے کہا اپنا مال تو ہی رکھ ، فقط اتنی بات ہے کہ تم تینوں کا امتحان لیا گیا تھا ، اور اللہ تعالیٰ تجھ سے خوش اور راضی ہوگیا ہے اور تیرے ان ساتھیوں سے غصہ اور ناراض ہے ۔ (بخاری و مسلم)

اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کے علاوہ جو عام انسانوں پر ہیں ہم مسلمانوں پر سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ ہمارے پاس اس کا دین موجود ہے جو دنیا و آخرت کی کامرانی کا واحد راستہ ہے ۔ قرآن مجید میں ہے :

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ ۔ اے مسلمانو! آج میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا ۔

وَ اَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ وَ رَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا ؕ (پ ۶ رکوع ۴) تم پر اپنی نعمت تمام کردی اور اسلام کو تمہارا دین بنا کر میں راضی اور خوش ہو گیا۔

اس عظیم نعمت کا شکریہ ہے کہ ہم اس دین کو جانیں اور اس پر عمل کریں، اسے پھیلائیں اور اسے غالب کرنے کی کوشش کریں۔ ہم مسلمان پورے عالم اسلامی میں جس المناک صورت حال سے دوچار ہیں اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ ہم اس کی بخشی ہوئی نعمتوں کو اس کی مرضی کے خلاف استعمال کر رہے ہیں اور اس کی عظیم نعمت دین کی انتہائی ناشکری کر رہے ہیں۔

توکّل

قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَوۡ انتم تتوکّلون علی اللّٰہ حق توکّلہ لرزقتم کما ترزق الطیر تغدُو خِماصا وتروح بِطانًا۔ (ترمذی)

اگر تم اللہ تعالیٰ پر پورا پورا توکل کرو تو تم کو اس طرح رزق دیا جائیگا جس طرح پرندوں کو دیا جاتا ہے کہ صبح کو بھوکے جاتے ہیں اور شام کو پیٹ بھر کر واپس آتے ہیں۔

تشریح: توکل کے لفظی معنی بھروسہ کرنے کے ہیں، اور شریعت کی اصطلاح میں توکل "اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنے کو کہتے ہیں"۔ بندۂ مومن اس حقیقت پر یقین رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کل کائنات اور تمام انسانوں کا خالق، مالک، حاکم و رازق و پروردگار ہے۔ اور زندگی، موت، نفع، نقصان، عزت و ذلت، دولت، اولاد ہر چیز اسی کے ہاتھ میں ہے۔ جب وہ دیتا ہے تو ملتی ہے اور جب وہ چھین لیتا ہے تو چھن جاتی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نہ دے تو کوئی دینے والا نہیں، اور وہ چھینا نہ چاہے تو کوئی

چھیننے والا نہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ۝ اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝ اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًۢا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ تَعٰلَى اللّٰهُ

کیا وہ ہستی جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تمہارے لئے آسمان سے پانی اُتارا اور اسی پانی کے ذریعہ پُر رونق باغ اُگائے۔ تمہارے بس میں یہ بات نہ تھی کہ تم ان باغوں کے درخت اُگا سکتے۔ کیا وہ خدا بہتر ہے یا اُن کے معبودانِ باطل کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور بھی خدا ہے؟ نہیں۔ اس کے باوجود یہ لوگ دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں۔ کیا وہ ہستی جس نے زمین کو جائے قرار بنایا، زمین میں دریا رواں دواں کئے، زمین کو ٹھہرانے کیلئے پہاڑ بنائے اور دو سمندروں کے درمیان حد فاصل بنائی۔ وہ بہتر ہے یا معبودان باطل؟ کیا اللہ کے سوا کوئی اور بھی خدا ہے؟ نہیں۔ ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے۔ کیا جو ہستی بے چین اور پریشان حال انسانوں کی دعا کو جبکہ وہ دعا کرتا ہے تو وہ سنتی ہے اور مصیبت کو دور فرماتی ہے اور تمہیں زمین میں با اقتدار اور خلیفہ بناتی ہے وہ بہتر ہے یا ان کے معبودان باطل؟ کیا اللہ کیساتھ کوئی اور بھی خدا ہے؟ نہیں۔ لیکن یہ لوگ کم ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں۔ کیا وہ ذات جو تمہیں خشکی اور تاریکیوں میں رہنمائی کرتی ہے اور ہواؤں کو اپنی رحمت (بارش) کے آگے

عَمَّا یُشْرِکُوْنَ ۝ اَمَّنْ یَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ وَ مَنْ یَّرْزُقُکُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ ءَ اِلٰـهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ۔ (پ۲۰ رکوع ۱)۔

آگے بشارت بنا کر بھیجتی ہے۔ وہ بہتر ہے یا ان کے معبودان باطل؟ کیا اللہ کے سوا کوئی اور بھی خدا ہے؟ نہیں۔ اللہ اس شرک سے پاک ہے جو یہ کرتے ہیں کیا وہ خدا جو پیدائش کی ابتدا کرتا ہے پھر اسے دہراتا ہے اور تمہیں آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے وہ بہتر ہے یا ان کے معبودان باطل؟ کیا اللہ کیساتھ کوئی اور بھی خدا ہے؟ اے نبی ان سے کہو اپنی دلیل لاؤ اگر تم سچے ہو۔

ان آیات میں صاف لفظوں میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ زمین و آسمان کا سارا اقتدار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ انسان کی تمام ضروریات وہی پورا کرتا ہے۔ اس لئے انسان کے لئے صحیح رویہ صرف یہ ہے کہ وہ اللہ ہی کو اپنا معبود بنائے، اسی کی اعانت و بندگی کرے۔ اور اسی پر بھروسہ کرے"۔ ایک اور مقام پر ہے:

اَمَّنْ هٰذَا الَّذِیْ هُوَ جُنْدٌ لَّکُمْ یَنْصُرُکُمْ مِّنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ۔ (پ۲۹ رکوع۲)

خدائے رحمٰن کے سوا کون ہے جو تمہاری فوج بنکر تمہاری مدد کر سکے۔

حقیقت یہ کہ اللہ پر توکل، ایمان لانے کا لازمی تقاضا ہے۔ جو شخص اللہ پر بھروسہ نہیں کرتا وہ فی الواقع اللہ پر ایمان نہیں لاتا۔ اور وہ شخص جو اللہ پر بھروسہ کرنے کے ساتھ دوسرے سہارے بھی تلاش کرتا ہے وہ فی الحقیقت شرک کا رویہ اختیار کرتا ہے۔ یہ بات بھی سوچنے کی ہے کہ انسان اللہ کے علاوہ کسی اور سہارے کو تجویز کر رکھتے ہیں ان کا حال مکڑی کے گھر جیسا ہے۔ جیسے مکڑی بناتی ہے اور یقیناً مکڑی کا گھر بہت کمزور ہوتا ہے کاش یہ لوگ جان لیتے۔

اللہ پر توکل انسان کو غیر اللہ سے بے نیاز اور بے خوف کر دیتا ہے۔ اور اللہ

کی بے پناہ قوت کا احساس اس کے اندر انتہا قوت پیدا کر دیتا ہے اور وہ انتہائی ناسازگار حالات میں بھی خود کو تنہا اور کمزور نہیں سمجھتا۔ قرآن مجید میں رسولوں کی زبانی کہلوایا گیا ہے کہ:

وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ	ہم اللہ پر کیوں نہ بھروسہ کریں جبکہ اللہ ہی وہ ہے
وَقَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا ؕ وَلَنَصْبِرَنَّ	جس نے ہم پر کامیابی کے راستے واضح فرمائے
عَلٰى مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ	اور اے مخالفو! ہم تمہاری اذیت دہانی پر
فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۝ۧ	ضرور صبر کا رویہ اختیار کریں گے اور بھروسہ کرنے
(پ ۱۳ رکوع ۱۳)۔	والوں کو صرف اللہ پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔

ایک اور مقام پر اہل ایمان کی ایمانی کیفیت کو واضح کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ	یہ وہ لوگ ہیں جن سے کچھ لوگوں نے کہا کہ یقیناً
اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ	لوگوں (دشمنوں) نے تمہارے خلاف بہت سروسامان
فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا	کر رکھا ہے تو تم ان سے ڈرو۔ اس بات سے ان کا ایمان
وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ	اور بڑھ گیا اور کہہ اُٹھے کہ ہمارے لئے اللہ بالکل
الْوَكِيْلُ۔ (پ ۴ رکوع ۸)	کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔

قرآن مجید میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی گئی ہے کہ:

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا	ان (اہل ایمان) سے معاملات میں مشورہ
عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ	کرو تو جب مشورہ کے بعد کوئی پختہ رائے
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ۔	کر لو تو اللہ پر بھروسہ کرو۔ یقیناً اللہ
(پ ۴ رکوع ۷)۔	توکل کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔

قرآن مجید کی اس ہدایت سے معلوم ہوا کہ جب انسان غور وفکر کے بعد کسی نتیجہ پر پہونچ

جائے تو اسے عزم و استقلال اور یکسوئی کے ساتھ قدم اٹھا دینا چاہیئے اور تذبذب اور خوف و ہراس اور مایوسی کے بجائے اللہ پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔

لیکن توکل کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ انسان ظاہری اسباب اور تدابیر اختیار نہ کرے اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے۔ اگر توکل کا یہ مفہوم ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے مقدس ساتھی دین کے پھیلانے اور اس کو غالب کرنے میں غیر معمولی جدوجہد نہ کرتے اور مصیبتیں نہ اٹھاتے اور نہ اہل ایمان اپنی معاش کے لیئے دوڑ دھوپ کرتے۔

توکل کا مطلب یہ ہے کہ انسان ناجائز تدابیر اختیار نہ کرے۔ گھبراہٹ، مایوسی کا شکار نہ ہو۔ سکون و اطمینان کے ساتھ جائز تدابیر اختیار کرے۔ اور اللہ پر بھروسہ رکھے کہ اگر اس کی مشیت و حکمت کا تقاضا ہوا تو وہ اس کی تدابیر کو کامیاب بنائے گا۔ تدابیر پر اعتماد کرنے کے بجائے اللہ پر اعتماد کرے اور جہاں کوئی تدبیر کارگر نہ ہو رہی ہو وہاں بھی مایوس نہ ہو، بلکہ یقین رکھے کہ اصل چیز تدبیر نہیں بلکہ اللہ کی مشیت و حکمت ہے۔ مندرجہ بالا حدیث میں بھی توکل کا یہی مفہوم ہے۔ پرندوں کو گھونسلے میں بیٹھے بیٹھے رزق نہیں مل جاتا۔ وہ صبح ہوتے ہی اپنے گھونسلوں سے نکلتے ہیں زمین اور فضا میں پھیل جاتے ہیں۔ تلاش رزق میں پوری جدوجہد کرتے ہیں اور شام کو شکم سیر ہو کر لوٹتے ہیں۔ اسی طرح بندۂ مومن اللہ پر بھروسہ کرتا ہے۔ اور اس بھروسہ کے نتیجہ میں ناجائز تدابیر سے اجتناب کرتا ہے اور صحیح تدابیر اختیار کرتا ہے اللہ اسے اپنے رزق سے نوازتا ہے اور اس کی ضروریات کو پوری فرماتا ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "قرآن مجید میں ایک آیت ایسی ہے کہ اگر لوگ اسے مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیں تو اُن کے لیئے کافی ہو جائے" پھر آپ نے قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی:

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۙ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ؕ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ؕ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا ۔ (پ ۲۸ رکوع ۱۶)	جو کوئی اللہ کی نافرمانی سے بچے گا اور رضا کا راستہ اختیار کریگا اللہ تعالیٰ اس کیلئے راہ کھولے گا اور اُس کیلئے اُن راہوں سے رزق دیگا جس کا اسکو وہم وگمان نہ ہوگا۔ اور جو کوئی اللہ پر بھروسہ کرے گا اللہ اس کے لئے کافی ثابت ہوگا۔ یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے فیصلہ کو پورا کر کے رہتا ہے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا ایک منصوبہ تیار کر رکھا ہے۔

مہمان نوازی

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مَنْ كَانَ يؤمن باللہ واليوم الآخر فليكرم ضيفهٗ ۔ (بخاری ومسلم)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو کوئی اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہیئے کہ اپنے مہمان کی خاطر مدارات کرے۔

تشریح: عام طور سے ہمارے یہاں اُس کو مہمان سمجھا جاتا ہے جس سے جان پہچان ہو یا رشتہ داری ہو یا کسی واقف کار سے تعلق رکھتا ہو۔ جس سے جان پہچان نہ ہو مسافر ہو، ہم اس کو مہمان نہیں جانتے۔ نہ ہم اس کی خاطر تواضع کرتے ہیں نہ اس کے آرام وسہولت کا انتظام کرتے ہیں۔ مگر اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ خواہ جان پہچان ہو یا نہ ہو، اپنے اور بیگانے مہمان کی خاطر ومدارات کرو، اپنی حیثیت کے مطابق اُس کی خاطر وتواضع کرو، جس چیز کی ضرورت ہو اس کو مہیا کرو۔ اگر زیادہ دن ٹھہرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو ایسی روش اختیار کرو جس کو آخیر تک نبھا سکو۔ مہمان کی خاطر وتواضع کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہیں بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کے فرمانے کا منشا یہ ہے کہ آپ اس سے خوش ہو کر ملیں۔ اس سے بات کرنے میں اپنی رسوائی اور بے عزتی نہ سمجھیں، اپنی حیثیت سے کم درجہ کا مہمان جب آئے تو آپ اس کے ساتھ بھی ویسا ہی برتاؤ کریں جیسا اپنے برابر والوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ آپ ایسے مہمان کی طرف سے بے توجہ نہ ہوں، اس کی دل جوئی کریں اور آپ اپنی دلچسپیوں اور کاموں کو کچھ دیر کے لئے چھوڑ دیں اور اس سے پوری پوری دل چسپی لیں تاکہ وہ جس محبت اور الفت کے ساتھ آیا ہے اس میں زیادتی ہو، اس کے دل میں آپ کا وقار اور عزت قائم ہو۔

شرم وحیاء

قَالَ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلْحَیَاءُ شُعْبَۃٌ مِّنَ الْاِیْمَانِ (بخاری) — حیاء ایمان کی ایک شاخ ہے۔

تشریح: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے معلوم ہوا کہ حیاء ایمان کا جزو ہے۔ اگر کسی شخص میں حیا نہیں ہے تو وہ ایمان کے ایک حصّہ سے محروم ہے۔ بالفاظ دیگر اس کا ایمان ناقص ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "حیاء سرتاسر خیر ہے" ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "حیا ہمیشہ خیر ہی کی موجب بنتی ہے"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات سے معلوم ہوا کہ حیا نہ صرف یہ کہ سراسر نیکی ہے بلکہ بے شمار نیکیوں کا ذریعہ بنتی ہے۔ حیاء اس چیز کا نام ہے کہ انسان کو بُری اور گندی چیزوں سے نفرت ہو۔ کُھلی بات ہے کہ اگر کسی انسان میں یہ صفت موجود ہو تو وہ گندی اور بُری باتوں سے خود بخود بچے گا اور نہ ہو تو برائیوں میں لت پت

ہو جائے گا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ پچھلے انبیاء علیہم السّلام کے ارشادات میں سے انسانوں کو یہ بات ملی ہے کہ جب تمہارے پاس حیا نہ ہو تو تم جو چاہے کر سکتے ہو۔ اسی بات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح بھی بیان فرمایا ہے کہ "حیاء ایمان کا جزو ہے" اور ایمان جنّت میں لے جائیگا، اور بے حیائی اللہ سے بیوفائی ہے اور بیوفائی دوزخ میں لے جائے گی۔

ایک اور موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حیا اور ایمان ایک دوسرے کے ساتھی ہیں جب ان میں سے کوئی ایک چلا جائے گا تو دوسرا بھی چلا جائے گا۔"

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اس کی بندگی کا اس کے سوا کوئی مطلب نہیں کہ انسان اپنی پوری زندگی میں اخلاقی اصولوں کا پابند ہو، لیکن اخلاقی اصولوں کی پابندی اسی وقت ممکن ہے جب انسان میں حیاء کی صفت ہو، اگر کسی شخص میں حیاء نہیں ہے اور اس کی طبیعت گندی اور بری باتوں سے مانوس ہوگئی ہے تو وہ ایمان کا دعویٰ کرتے ہوئے ایمان کی راہ پر نہیں چل سکتا۔ کیونکہ بے حیائی انسان کے بہترین جذبات کو بھڑکا دیتی ہے اور اس کو خواہشات کا اندھا پیرو بنا دیتی ہے جبکہ ایمان کا یہ مطالبہ ہے کہ انسان خواہشات کے بجائے اللہ کے دین اور اخلاقی اصولوں کا پابند بنے۔ یہی بات ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح فرمائی ہے کہ ہر دین کا ایک کردار ہوتا ہے اور اسلام کا کردار "حیاء" ہے۔"

ایک اور موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن کی میزان میں قیامت کے روز سب سے زیادہ باوزن چیز اچھا اخلاق ہوگا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اللہ بے حیا اور بدگو کو مبغوض رکھتا ہے۔

آج کل ہر طرف بے حیائی اور گندی باتوں کا چرچا ہے۔ گندے گانے، عریاں

تصویریں، گندی فلمیں، گندے ناول اور افسانے اور بے حیائی کے مناظر قدم قدم پر ملتے ہیں اور نوجوانوں کے بگاڑنے اور علم و عمل سے انھیں بیگانہ کرنے میں ان گندگیوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ اگر کسی شخص کو اپنا ایمان اور اخلاق عزیز ہے اور وہ بے کردار اور بدکردار نہیں بننا چاہتا تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو ان گندگیوں سے بہت دور رکھے۔ یہی نہیں، یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں اور اپنے ماحول کو ان گندگیوں سے زیادہ سے زیادہ پاک و صاف رکھنے کی کوشش کرے اور گندگی کے اس سیلاب کو روکنے کے لئے اپنا پورا زور لگا دے، کیونکہ ماحول میں اگر بے حیائی عام ہو گئی تو نیک سے نیک انسان بھی اس کے اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتا

جھوٹ

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
کَبُرَتْ خِیَانَۃً اَنْ تُحَدِّثَ	یہ زبردست خیانت ہے کہ تم ایک بات اپنے
اَخَاکَ حَدِیْثًا ھُوَ لَکَ بِہٖ مُصَدِّقٌ	بھائی سے کہو اور وہ تمہیں سچا جانے اور تم اس
وَّاَنْتَ بِہٖ کَاذِبٌ۔ (ابوداؤد)	سے جھوٹ بات کہو۔

تشریح: جھوٹ کو تمام لوگ بُرا جانتے ہیں۔ اسلام نے جھوٹ کو بڑا سخت گناہ بنایا ہے اور بتایا کہ جھوٹ بولنے والے کی سزا آگ ہے یعنی قیامت کے دن وہ دوزخ میں جائے گا۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے پوچھا مومن جھوٹا ہوتا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مومن میں ہر طرح کی عادتیں ہو سکتی ہیں مگر خیانت (بے ایمانی) اور جھوٹ کی عادت نہیں ہو سکتی۔ آپ نے فرمایا کہ یہ بڑی خیانت ہے کہ تم ایک بات اپنے بھائی سے کہو اور وہ تمہیں سچا جانے اور تم

اس سے جھوٹ بول رہے ہو۔ حضور کو جھوٹ سے بڑی نفرت تھی۔ اگر کسی کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جان لیتے کہ یہ جھوٹا ہے تو اس سے نفرت فرماتے جب تک آپ کو یہ نہ معلوم ہو جاتا کہ اس نے اپنی بُری عادت چھوڑ دی ہے۔ جھوٹ کو آپ نے منافق کی نشانی بتایا ہے۔ جھوٹ کو بُرائی کا راہبر بنایا ہے۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "سچائی کو اختیار کرو کیونکہ سچائی انسان کو نیک بناتی ہے اور نیکی جنت کی طرف لے جاتی ہے اور انسان لگاتار سچ بولتا اور سچائی کے درپے رہتا ہے یہانتک کہ اللہ کے یہاں اس کا شمار صدیقین میں ہوتا ہے۔ اور جھوٹ سے بچو کیونکہ جھوٹ اللہ کی نافرمانی کی طرف لے جاتا ہے اور نافرمانی دوزخ کی طرف۔ اور بندہ برابر جھوٹ بولتا اور جھوٹ بولنے کے درپے رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا شمار کذّابین (جھوٹوں) میں ہوتا ہے۔"

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سچائی نیکی اور اصلاح کی بنیاد ہے۔ جو انسان ہمیشہ سچ بولتا ہے وہ گناہ پر جم نہیں سکتا۔ کیونکہ ہر شخص اپنے گناہ کو چھپانا چاہتا ہے اور سچ بولنے والا اپنے عیب کو چھپا نہیں سکتا۔ اس کے برعکس جھوٹ ساری بُرائیوں کی جڑ ہے کیونکہ جھوٹ بولنے والا نہ صرف یہ کہ بہت بڑے گناہ کا ارتکاب کرتا ہے بلکہ وہ جھوٹ بول بول کر اپنے بہت سے گناہوں کو چھپاتا اور پروان چڑھاتا رہتا ہے اسے اپنی اصلاح کی توفیق نہیں ہوتی بالآخر وہ جہنم کی آگ میں جا گرتا ہے۔ اس کے برعکس سچ بولنے والا سچائی کا اجر تو پاتا ہی ہے وہ مزید برآں اپنے گناہوں سے توبہ کرنے، اور اپنی غلطیوں کی اصلاح کرنے اور بہت سی نیکیاں کرنے کی توفیق پاتا ہے جس کے نتیجہ میں اس کا شمار صدیقین میں ہوتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور جنت پاتا ہے۔ جھوٹ

انسان کا بدترین عیب ہے۔ اس سے دنیا میں فساد پھیلتا ہے، ہزاروں جانیں، کروڑوں روپیہ برباد ہوتا ہے، ملک کا ملک ویران ہو جاتا ہے، سعادت مند اور اچھے لوگ جھوٹ کے قریب بھی نہیں پھٹکتے۔ سچ آدمی کو جنت میں پہونچاتا ہے۔ سچ آدمی کو سیکڑوں دکھ اور مصیبت سے بچاتا ہے۔

چوری

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
لَا یَسْرِقُ السَّارِقُ حِیْنَ یَسْرِقُ	کوئی چور مومن ہونے کی حالت میں
وَھُوَ مُؤْمِنٌ ۔ (بخاری)	چوری نہیں کرتا۔

تشریح: چوری کو ہر شخص بُرا جانتا ہے اور ہر مذہب اس کو جرم قرار دیتا ہے۔ اس سے بڑا فساد برپا ہوتا ہے، امن وامان خراب ہوتا ہے۔ اس لئے اسلام میں ہے کہ چوری کرنا ایمان کے منافی ہے مسلمان کی شان نہیں کہ وہ چوری جیسے بُرے فعل کو کرے۔ اگر اسلامی حکومت ہو تو وہ جرم ثابت ہونے پر چور کا بایاں[1] ہاتھ کاٹ دیگی۔ چوری کی یہ ایسی سزا ہے کہ جدھر وہ جائے گا دیکھنے والے جان لیں گے کہ اس نے چوری کی تھی۔ اس عبرتناک سزا کو دیکھ کر لوگ چوری سے بچیں گے۔ ایک بار ہاتھ کٹ جانے میں زندگی بھر کی رسوائی اور پریشانی کے لئے کافی ہے۔ ہاتھ کٹنے کے بعد دوبارہ چوری کرے تو اس کا بایاں پیر کاٹ دیا جائے گا اور اگر پھر بھی باز نہ آئے تو اس کا دایاں ہاتھ کاٹ دیا جائے، اس پر بھی باز نہ آئے تو اس کا دایاں پیر کاٹ دیا جائے گا پھر وہ

[1] قرآن میں بیان کی ہوئی یہ سزا سعودی عرب میں آج بھی نافذ ہے جسکا نتیجہ یہ ہے کہ چوری کی واردات وہاں پر نہ ہونیکے برابر ہے جبکہ مہذب ترین ملکوں میں چوری اور ڈکیتی کی واردات روزمرہ کا معمول ہے۔

لُنجا بن کر رہ جائے گا اور عمر بھر اس بُرے کام کو نہ کر سکے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک بار فاطمہ نامی قریشی معزز خاتون نے چوری کی تو اس کے گھر والوں نے چاہا کہ اس کا ہاتھ نہ کاٹا جائے اور روپیہ دے کر اس کو چھوڑ دیا جائے۔ سفارش کے لئے اسامہ بن زید کو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت محبوب اور پیارے تھے حضور کے پاس بھیجا۔ انھوں نے حضور کے سامنے اس بات کو رکھا۔ حضور کو یہ سن کر بڑا رنج ہُوا۔ آپ نے لوگوں کے ایک بڑے مجمع میں تقریر کی اور فرمایا کہ تم سے پہلے کے لوگ اس وجہ سے ہلاک ہوتے کہ ان سب کا کوئی معزز آدمی چوری کرتا تو اُسے چھوڑ دیتے اور کمزور چوری کا مرتکب ہوتا تو اس پر حد نافذ کر دیتے۔ خدا کی قسم اگر محمد کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں یقیناً اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔ پھر آپ نے اس عورت کا ہاتھ کٹوا دیا۔

سُود

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
لَعَنَ اللّٰہُ اٰکِلَ الرِّبٰوا وَمُؤْکِلَہٗ	سود کھانے والے اور کھلانے والے، سُود کی
وَشَاھِدَہٗ وَکَاتِبَہٗ۔ (ابوداؤد)	گواہی دینے اور لکھنے والے پر اللہ کی لعنت ہے۔

تشریح: اسلام میں سود لینا، دینا، گواہ بننا یا لکھنا بہت بڑا گناہ ہے۔ عرب میں اس کا عام دستور تھا۔ وہاں کے لوگ اگر کسی کو قرض پر روپیہ دیتے تو قرض لینے والے سے اصل رقم کے ساتھ کچھ زائد رقم وصول کرتے اور اسے نفع کہتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس قرض کے ساتھ نفع لیا جائے وہ سود ہے۔ لہٰذا کسی مسلمان کو جائز نہیں کہ وہ قرض دے کر کسی قسم کا نفع لے۔ اگر اس نے کسی طرح کا نفع

حاصل کیا تو یہ سود ہوگا۔ اور سود کی سزا جہنم ہے اور اللہ کی لعنت (رحمت سے دوری) ہے

سمرہ بن جندب کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مجھے دکھایا گیا ہے کہ ایک خون کی نہر چل رہی ہے جس میں ایک شخص غوطے کھا رہا ہے۔ وہ بیچ سے کنارے کی جانب آنا چاہتا ہے مگر وہ شخص جو کنارے پر کھڑا ہے اسے پتھر مار کر پیچھے ڈھکیل دیتا ہے جس سے وہ پھر غوطے کھانے لگتا ہے۔ میں نے جبرئیل سے پوچھا یہ کون ہے؟ تو انھوں نے بتایا کہ یہ سود خوار ہے اور ہر سود خوار کو قیامت کے دن یہی سزا ہوگی۔ (آپ نے یہ بھی فرمایا کہ جو عذاب سود خوار کو ہوگا وہی عذاب سودی دستاویز لکھنے والے اور اس کے گواہ کو بھی ہوگا)۔

ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا کہ ایک وقت آئے گا کہ سود عام ہو جائے گا۔ اور لوگ مختلف طریقوں سے اس کے جائز ہونے کا پہلو نکال لیں گے۔ صحابہ نے عرض کیا حضور! کیا اس زمانے میں اہل علم بھی اس میں شریک ہو جائیں گے؟ فرمایا بظاہر تو یہ متقی بنے رہیں گے مگر سود خوار لوگوں سے میل جول بند نہ کریں گے۔ ان کے تحفے اور ہدیے قبول کریں گے ان کی دعوتیں کھائیں گے۔ اس طرح سود کی گرد میں سن جائیں گے" آج وہی زمانہ ہے کہ مختلف ناموں اور ذریعوں سے سود لیا جاتا ہے۔ کہیں امداد باہمی کے نام سے ادارہ قائم ہے کہیں سیونگ بینک، کہیں بچت فنڈ، کہیں بیمہ کمپنی ہے غرض کہ بیسیوں سود کے طریقے ایجاد کر لئے گئے ہیں۔

واضح رہے کہ امداد باہمی یا بچت وغیرہ میں فی نفسہٖ کوئی قباحت نہیں ہے بلکہ یہ اچھی چیزیں ہیں مگر اس کے ساتھ سود کا جوڑ اس طرح لگا دیا گیا ہے کہ انسان سود کی لعنت میں مبتلا ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

سود کے بہت بڑے گناہ ہونے کا اس بات سے اندازہ کیجئے کہ قرآن مجید میں

اس پر اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے جنگ کی دھمکی دی گئی ہے ۔ وہ بھی اس سُود کے لینے پر جو اُس وقت واجب ہُوا تھا جبکہ اسلام میں سود کی حرمت نازل نہیں ہوئی تھی ۔قرآن مجید میں ہے کہ اے ایمان لانے والو ! اللہ سے ڈرو اور جو سود باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو اگر تم مومن ہو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے جنگ کا اعلان قبول کرو ۔"

واضح رہے کہ دُنیا کے ہر قانون کی طرح اسلامی قانون کا نفاذ بھی اس وقت سے ہوتا ہے جبکہ وہ قانون زیرِ عمل آیا اور اس سے قبل کی ساری کارروائیاں جو اس قانون کے خلاف ہوں جائز قرار پاتی ہیں ۔لیکن سود کا قانون اس سے مستثنیٰ ہے ۔جب سود کی حرمت کا قانون نازل ہُوا تو نہ صرف یہ کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آئندہ کے لئے سودی لین دین ممنوع قرار دیدیا بلکہ پچھلے سودی بقایا سے بھی روک دیا، اور جو شخص پھر اس سود کو وصول کرے اس کے خلاف جنگ کرنے کا حکم نازل فرمایا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام میں سود کی حرمت کتنی شدید ہے ۔

پہلے کی طرح آج بھی سودی کاروبار بدترین لعنت ہے اور بے شمار معاشی وسماجی اور اخلاقی خرابیوں کا موجب ہے ۔مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ سودی کاروبار سے خود بھی بچیں اور دوسروں کو بھی بچائیں اور اس غرض کے لئے بیت المال اور امداد باہمی کے ایسے ادارے قائم کریں جن سے سود کے بغیر ضرورت مندوں کو قرض مل سکتا ہو۔

بینک اور ڈاک خانہ کا سُود اپنی حقیقت کے اعتبار سے سُود ہی ہے اس لئے ہر مسلمان کو اس سُود سے بھی بچنا چاہیئے ۔ اور بینک یا ڈاک خانہ میں رقم رکھنے پر مجبور ہو تو نکالتے وقت سُود کو وصول نہ کرنا چاہیئے ۔اور یہ خیال کہ اگر یہ سود ہم وصول نہ کریں گے تو کسی غلط جگہ استعمال ہوجائے گا ایک غلط خیال ہے ۔سُود ہماری رقم ہی

نہیں کہ ہم اس بات کی فکر کریں کہ یہ رقم کہاں صرف کریں۔ وہ روپیہ کی شکل میں سانپ اور بچھو ہیں اور کم سے کم ہم ان بچھوؤں سے اپنے آپ کو بچالیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس رقم کو بینک سے نکال کر کسی غریب پر خرچ کر دینا چاہیئے لیکن ایسا کہنے والے یہ نہیں سوچتے کہ اس شکل میں ہم دو جرموں کے مرتکب ہو جاتے ہیں، ایک سود کی رقم لینے کے اور دوسرے اس بات کی گواہی دینے کے کہ مسلمان سود لے سکتا ہے۔ اور صرف سود کھانے سے بچ جاتے ہیں اور اپنے بجائے اپنے کسی بھائی کو کھلا دیتے ہیں۔

اسلامی حکومت میں سودی کاروبار نہ صرف اخلاقی جرم ہوگا بلکہ قانونی جرم بھی ہوگا۔ اور غیر مسلموں کو بھی اس کی اجازت نہ ہوگی اور اگر کوئی گروہ سودی کاروبار پر اصرار کریگا تو اس کے خلاف جہاد کیا جائے گا۔

کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ دور میں حکومت اور معاشیات کی گاڑی بینکنگ کے بغیر ایک قدم نہیں چل سکتی اور بینکنگ کی بنیاد سود پر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بینکنگ موجودہ دور کی ایک ناگزیر ضرورت ہے، اس کے بغیر سیاست و معیشت کی گاڑی کا چلنا غیر ممکن ہے، مگر یہ خیال صحیح نہیں کہ بینکنگ کے کاروبار کو سود ہی کی بنیاد پر چلایا جا سکتا ہے۔ خود معاشیات کے جدید ماہرین کا خیال ہے کہ بینکنگ میں سود کا جز وبے شمار خرابیوں کا موجب ہے۔ اور اسلامی ماہرین معاشیات کا کہنا ہے کہ سودی لین دین کے بغیر بھی بینک خوش اسلوبی کے ساتھ چلایا جا سکتا ہے۔

رشوت

لَعَنَ رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم الرَّاشي والمُرتَشِي (ابوداؤد)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے پر لعنت بھیجی ہے۔

تشریح : رشوت لینا بہت بُرا فعل ہے، اس سے انسانیت اور انصاف کا خون ہوتا ہے۔ رشوت کے ذریعہ انسان دوسروں کا حق مارنے پر تُل جاتا ہے اور بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اس حق تلفی کے نتیجہ میں پورے پورے خاندان تباہ ہو جاتے ہیں۔ پھر بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی، رشوت دینے والے کو لوگوں کے حقوق غضب کرنے کی مستقل عادت پڑ جاتی ہے اور وہ زندگی بھر لوگوں کے حقوق مار مار کر اپنے اور اپنے خاندان والوں کے لئے سانپ بچھو اکٹھا کرتا رہتا ہے اور اس کے خاندان اور گھر والے بھی حرام مال کھا کھا کر اور اپنے خاندان کے سربراہ کی ان حرکتوں کو دیکھ دیکھ کر اسی گندگی میں لت پت ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح جو شخص رشوت لیتا ہے اسے اس بات کی لت پڑ جاتی ہے کہ وہ تھوڑے پیسے لے کر ظالمانہ فیصلے کر کے لوگوں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالے اور اس کی طرح یہ عادت اس کے گھر والوں میں سرایت کر جاتی ہے اور حرام مال کھا کھا کر وہ بھی خُدا فراموشی اور بدکرداری کی پستیوں میں گرتے چلے جاتے ہیں۔

اب یہ جاننا ضروری ہے کہ رشوت کسے کہتے ہیں ؟

رشوت کی تعریف یہ ہے کہ کچھ رقم یا کوئی چیز دے کر کسی حقدار کے حق کو مارا جائے یا کسی ناحق کو حق ثابت کیا جائے۔ یا اپنے حق سے زائد وصول کیا جائے۔ اپنے جائز حق کو حاصل کرنے کے لئے یا ظلم سے بچنے کے لئے کسی کو کچھ دینا، یہ شکل کے اعتبار سے تو ضرور رشوت ہے مگر حقیقت کے اعتبار سے نہیں۔ البتہ جو شخص کسی دوسرے کو اس کا حق رشوت لے کر پہونچاتا ہے وہ رشوت کا ضرور مرتکب ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ رشوت کی گرم بازاری سے معاشرہ میں ظلم و فساد کی گرم بازاری ہو جاتی ہے اور عدالتیں جہاں سے مظلوموں کو انصاف کی توقع ہوتی ہے ظلم اور حق تلفی کا مرکز بن جاتی ہیں، اور حکام جن کا کام انصاف کو بحال کرنا، مظلوموں کو ظلم سے بچانا،

اور قانون کو نافذ کرنا ہوتا ہے۔ ناانصافی، ظلم اور لاقانونیت کے پھیلانے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ یہ صورت حال پوری کی پوری قوم کو اخلاقی، معاشی، سماجی اور سیاسی پہلو سے تباہ کر کے رکھ دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رحمۃ للعالمین ہوتے ہوئے رشوت دینے اور لینے والے دونوں پر لعنت بھیجی ہے، اور بددعا کی ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت دونوں میں اپنی رحمت سے انھیں محروم کر دے"

چغلخوری

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ نَمَّامٌ (بخاری و مسلم) — جنت میں چغل خور نہیں جائے گا۔

تشریح: چغلی سے دنیا میں بڑے فساد پیدا ہوتے ہیں، دوستوں میں بگاڑ ہو جاتا ہے، بھائیوں میں جدائی ہو جاتی ہے، دوستی ختم ہو جاتی ہے، دشمنی کی آگ بھڑک جاتی ہے، لڑائی جھگڑے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، گھر کے گھر مٹ جاتے ہیں، قوم کی قوم تباہ و برباد ہو جاتی ہے، اچھے اور شریف لوگ چغلی نہیں کھاتے وہ تو مجلس کی باتوں کو امانت سمجھتے ہیں اور اپنے دل میں رکھتے ہیں۔ ان تمام باتوں سے جن سے باہم لڑائی جھگڑا ہونے کا خطرہ ہو اس سے بچتے اور پرہیز کرتے ہیں، اگر لڑائی اور فساد ہوتا ہے تو اس کے دور کرنے کی اور باہم صلح کرانے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ ایسے لوگ خدا کو بہت محبوب اور پیارے ہوتے ہیں، لڑائی جھگڑے کو ختم کرانا اور صلح کرانے کا اجر و ثواب نفل نماز، صدقہ اور خیرات سے بھی زیادہ بتایا گیا ہے۔

جو لوگ اِدھر کی اُدھر لگاتے ہیں وہ لوگوں کی نگاہ میں بڑے ذلیل ہوتے ہیں

ان کے سامنے لوگ بات نہیں کرتے، انھیں اپنی مجلس میں آنے نہیں دیتے۔ مثل مشہور ہے کہ چغل خور کی صحبت سے ایسا بھاگ جیسے دیوانے کتے سے۔ اور اس کی باتوں سے ایسی نفرت کر جیسے گندگی سے۔ کیونکہ چغل خوری اُن بُرے فعلوں میں سے ہے جن سے بجائے ملنے کے دو بھائیوں کا کٹ جانا یقینی ہے۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حرام قرار دیا اور فرمایا کہ اس کی سزا جہنم ہے کسی مسلمان کیلئے جائز نہیں ہے کہ وہ اِدھر اُدھر لگاتا پھرے۔ آج کل چغل خوری کا مرض عام ہوگیا ہے اور اسے کوئی شخص گناہ اور جرم نہیں سمجھتا۔ بہت سے ہیں جو حاکموں سے لوگوں کی چغلی کرتے ہیں اور انھیں طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا کر دیتے ہیں، اور کچھ لوگ مسائل میں ادھر اُدھر لگاتے ہیں جس سے علماء میں لڑائی کراتے ہیں۔ کچھ رشتوں ناطوں میں لگائی بجھائی کر کے بنا بنایا کام غارت کر دیتے ہیں۔ عورتیں بھی اس مرض میں مبتلا ہیں اور مرد اور بچے بھی۔ جس کی وجہ سے مسلمانوں کا شیرازہ بکھرا ہوا ہے اور وہ تباہ و برباد ہو رہے ہیں۔ پس اس کا علاج صرف ایک ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے کہ لوگ چغل خوری چھوڑ دیں۔ دوسروں کو اس کی وعید سنائیں، بچوں کو سمجھائیں اور بڑوں کی اصلاح کریں تاکہ معاشرہ اس خرابی سے پاک ہو۔

غیبت

عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اتدرون ما الغیبۃ. قالوا اللہ ورسولہ اعلم. قال ذکرك	حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کیا تمہیں معلوم ہے کہ غیبت کیا ہے؟ صحابہ نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کے رسول زیادہ

اَخاكَ بما يكره۔ قيل	جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا غیبت یہ ہے کہ "تو
اَفَرأيتَ اِن كان فى اَخى ما اقول	اپنے بھائی کا ذکر اس طرح کرے جو اسے ناگوار ہو۔
قال ان كان فيه ما تقول۔	عرض کیا گیا کہ اگر میرے بھائی میں وہ بات پائی
فقد اغتبتهٗ وان لم يكن	جاتی ہو جو میں کہہ رہا ہوں تو اس صورت میں آپکا
فيه ما تقول فقد بهتّهٗ۔	کیا خیال ہے؟ فرمایا اگر اسمیں وہ بات پائی جاتی ہو تو تو نے
(مسلم)۔	اسکی غیبت کی۔ اگر اسمیں وہ موجود نہ ہو تو تو نے اسپر بہتان لگایا

تشریح: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ کسی شخص کے خلاف اس کے پیچھے جھوٹا الزام لگانا بہتان ہے اور اس کے واقعی عیوب بیان کرنا غیبت ہے۔ یہ فعل خواہ صریح الفاظ میں کیا جائے یا اشارہ کنایہ میں، بہر صورت حرام ہے۔ اسی طرح یہ فعل خواہ آدمی کی زندگی میں کیا جائے یا اس کے مرنے کے بعد، دونوں صورتوں میں اس کی حرمت یکساں ہے۔

ابو داؤد کی روایت میں ہے کہ ماعز بن مالک اسلمی کو جب زنا کے جرم میں رجم کی سزا دی گئی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے راہ چلتے ایک صاحب کو اپنے دوسرے ساتھی سے یہ کہتے سن لیا کہ "اس شخص کو دیکھو! اللہ نے اس کا پردہ ڈھانک لیا تھا مگر اس کے نفس نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا جب تک یہ کتّے کی موت نہ مار دیا گیا"، کچھ دور آگے جا کر راستے میں ایک گدھے کی لاش سڑتی ہوئی نظر آئی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم رک گئے اور ان دونوں اصحاب کو بلا کر فرمایا "اترو اور اس گدھے کو کھاؤ"! ان دونوں نے عرض کیا یا رسول اللہ اسے کون کھائے گا؟ فرمایا ابھی ابھی تم لوگ اپنے بھائی کی عزت پر جو حرف زنی کر رہے تھے وہ اس گدھے کی لاش کھانے سے بہت زیادہ بری تھی۔ قرآن مجید میں ہے:

لَا یَغْتَبْ بَّعْضُکُمْ بَعْضًا ط	تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے۔ کیا تمہارے
اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ	اندر کوئی ایسا ہے جو اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت
لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا فَکَرِهْتُمُوْهُ ط	کھانا پسند کرے گا؟ دیکھو تم خود اس سے گھن کھاتے
وَاتَّقُوا اللّٰهَ ط اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ	ہو۔ اللہ سے ڈرو۔ بیشک اللہ بڑا توبہ قبول
رَّحِیْمٌ۔ ۝ (پ ۲۶ رکوع ۱۴)۔	کرنے والا اور رحیم ہے۔

اس فقرے میں اللہ تعالیٰ نے غیبت کو مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانے سے تشبیہ دے کر اس فعل کے انتہائی گھناؤنا ہونے کا تصور دلایا ہے۔ مُردار کا گوشت کھانا بجائے خود نفرت کے قابل ہے کجا کہ وہ گوشت بھی کسی جانور کا نہیں بلکہ انسان کا ہو، اور انسان بھی کوئی اور نہیں خود اپنا بھائی ہو۔ پھر اس تشبیہ کو سوالیہ انداز میں پیش کر کے اور زیادہ مؤثر بنا دیا گیا ہے تاکہ ہر شخص اپنے ضمیر سے خود پوچھ کر فیصلہ کرے کہ آیا وہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانے کے لئے تیار ہے؟ اگر نہیں ہے اور اس کی فطرت اس چیز سے گھن کھاتی ہے تو آخر وہ کیسے یہ بات پسند کرتا ہے کہ اپنے ایک مومن بھائی کی غیر موجودگی میں اس کی عزت پر حملہ کرے جہاں وہ اپنی مدافعت نہیں کر سکتا اور جہاں اس کو یہ خبر تک نہیں ہے کہ اس کی بے عزتی کی جا رہی ہے؟ اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ غیبت کے حرام ہونے کی بنیادی وجہ اس شخص کی دل آزاری نہیں ہے جس کی غیبت کی گئی ہو، بلکہ کسی شخص کی غیر موجودگی میں اس کی برائی بجائے خود حرام ہے قطع نظر اس سے کہ اس کو اس کا علم ہو یا نہ ہو اور اس کو اس فعل سے اذیت پہونچے یا نہ پہونچے۔ ظاہر ہے کہ مرے ہوئے آدمی کا گوشت کھانا اس لئے حرام نہیں ہے کہ مُردے کو اس سے تکلیف ہوتی ہے، مُردہ بے چارہ تو اس سے بے خبر ہوتا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد کوئی اس کی لاش کو بھنبھوڑ رہا ہے، مگر یہ فعل بجائے خود ایک

نہایت گھناؤنا فعل ہے۔ اس حرمت سے مستثنیٰ صرف وہ صورتیں ہیں جن میں کسی شخص کے پیٹھ پیچھے یا اس کے مرنے کے بعد اس کی برائیاں بیان کرنے کی ایسی ضرورت پیش ہو جو شریعت کی نگاہ میں ایک صحیح ضرورت ہو اور وہ ضرورت غیبت کے بغیر پوری نہ ہو سکتی ہو، اور اس کے لئے اگر غیبت نہ کی جائے تو غیبت کی بہ نسبت زیادہ بڑی برائی لازم آتی ہو۔

ایک مرتبہ ایک بدو آکر حضور کے پیچھے نماز میں شامل ہوا اور نماز ختم ہوتے ہی یہ کہتا ہوا چلا یا کہ "خدایا مجھ پر رحم کر اور محمدؐ پر، اور ہم دونوں کے سوا کسی کو اس رحمت میں شریک نہ کر"۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے فرمایا "تم کیا کہتے ہو، یہ شخص زیادہ نادان ہے یا اس کا اونٹ؟ تم نے سنا نہیں کہ یہ کیا کہہ رہا تھا؟ (ابوداؤد)"۔ یہ بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے پیٹھ پیچھے کہنی پڑی، کیونکہ وہ سلام پھیرتے ہی جا چکا تھا۔ اس نے چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ایک بہت غلط بات کہہ دی تھی اور آپ کا اس پر خاموش رہ جانا کسی شخص کو اس غلط فہمی میں ڈال سکتا تھا کہ ایسی بات کہنا کسی درجہ میں جائز ہو سکتا ہے اس لئے ضروری تھا کہ آپ اس کی تردید فرمائیں۔

ایک خاتون فاطمہ بنت قیس کو دو صاحبوں نے نکاح کا پیغام دیا۔ ایک حضرت معاویہ، دوسرے حضرت ابوالجہم۔ انھوں نے آکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مشورہ لیا۔ آپ نے فرمایا "معاویہ مفلس ہیں اور ابوالجہم بیویوں کو بہت مارتے ہیں (بخاری ومسلم)" یہاں ایک خاتون کے لئے ایک مستقبل کی زندگی کا مسئلہ درپیش تھا اور حضور سے انھوں نے مشورہ طلب کیا تھا۔ اس حالت میں آپ نے ضروری سمجھا کہ دونوں صاحبوں کی کمزوریاں آپ کے علم میں ہیں وہ انھیں بتادیں۔

ایک موقع پر حضرت ابوسفیان کی بیوی ہند بنت عتبہ نے آکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ " ابوسفیان بخیل آدمی ہیں مجھے اور میرے بچوں کو اتنا نہیں دیتے جو ضروریات کے لئے کافی ہو۔" (بخاری و مسلم) بیوی کی طرف سے شوہر کی غیر موجودگی میں یہ شکایت اگرچہ غیبت تھی، مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو جائز رکھا، کیونکہ مظلوم کو یہ حق پہونچتا ہے کہ ظلم کی شکایت کسی ایسے شخص کے پاس لیجائے جو اس کو دُور کرا سکتا ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان نظیروں سے استفادہ کرکے فقہاء و محدثین نے یہ قاعدہ اخذ کیا ہے کہ " غیبت صرف اس صورت میں جائز ہے جبکہ شرعاً ایک صحیح غرض کے لئے اس کی ضرورت ہو اور وہ ضرورت اس کے بغیر پوری نہ ہو سکتی ہو پھر اسی قاعدہ کو پیش نظر رکھ کر علماء نے غیبت کی حسب ذیل صورتیں جائز قرار دی ہیں:

(۱)۔ ظالم کے خلاف مظلوم کی شکایت ہر اس کے سامنے جس سے وہ توقع رکھتا ہو کہ وہ ظلم کو دفع کرنے کے لئے کچھ کر سکتا ہے۔

(۲)۔ اصلاح کی نیت سے کسی شخص یا گروہ کی برائیوں کا ذکر ایسے لوگوں کے سامنے جن سے یہ اُمید ہو کہ وہ اُن برائیوں کو دُور کرنے کے لئے کچھ کر سکیں گے۔

(۳)۔ استفتاء کی غرض سے کسی مفتی کے سامنے صورت واقعہ بیان کرنا جس میں کسی شخص کے کسی غلط فعل کا ذکر آ جائے۔

(۴)۔ لوگوں کو کسی شخص یا اشخاص کے شر سے خبردار کرنا تاکہ وہ اس کے نقصان سے بچ سکیں۔ مثلاً راویوں، گواہوں اور مصنفین کی کمزوریاں بیان کرنا بالاتفاق جائز ہی نہیں واجب ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر شریعت کو غلط روایتوں سے، عدالتوں کو

بے انصافی سے، اور عوام یا طالبان علم کو گمراہیوں سے بچانا ممکن نہیں ہے۔ مثلاً کوئی شخص کسی سے شادی بیاہ کا رشتہ کرنا چاہتا ہو، یا کسی کے پڑوس میں مکان لینا چاہتا ہو، یا کسی سے شرکت کا معاملہ کرنا چاہتا ہو یا کسی کو اپنی امانت سونپنا چاہتا ہو اور آپ سے مشورہ لے تو آپ کے لئے واجب ہے کہ اس کا عیب وصواب اسے بتادیں تاکہ وہ ناواقفیت میں دھوکہ نہ کھائے۔

(۵) ایسے لوگوں کے خلاف علی الاعلان آواز بلند کرنا اور ان کی برائیوں پر تنقید کرنا جو فسق وفجور پھیلا رہے ہوں، یا بدعات اور گمراہیوں کی اشاعت کر رہے ہوں۔ یا خلق خدا کو بے دینی اور ظلم وجور کے فتنوں میں مبتلا کر رہے ہوں۔

(۶) جو لوگ کسی بُرے لقب سے اس قدر مشہور ہو چکے ہوں کہ وہ اس لقب کے سوا کسی اور لقب سے پہچانے نہ جا سکتے ہوں ان کے لئے وہ لقب استعمال کرنا بغرض تعریف نہ کہ بغرض تنقیص۔

ان مستثنیٰ صورتوں کے سوا پیٹھ پیچھے کسی کی بدگوئی کرنا مطلقاً حرام ہے۔ یہ بدگوئی اگر سچی ہو تو غیبت، جھوٹی ہو تو بہتان ہے اور دو آدمیوں میں لڑائی کرانا ہو تو چغلی ہے۔ شریعت ان تینوں کو حرام قرار دیتی ہے۔

اسلامی معاشرے میں ہر مسلمان پر یہ لازم ہے کہ اگر اس کے سامنے کسی شخص پر جھوٹی تہمت لگائی جا رہی ہو تو وہ اس کو خاموشی سے نہ سُنے بلکہ اس کی تردید کرے، اگر کسی جائز شرعی ضرورت کے بغیر کسی کی واقعی بُرائیاں بیان کی جا رہی ہوں تو اس فعل کے مرتکبین کو خدا سے ڈرائے اور اس گناہ سے باز رہنے کی تلقین کرے۔ اور غیبت کرنے والا، تو جس وقت بھی اسے احساس ہو جائے کہ وہ اس گناہ کا ارتکاب کر رہا ہے یا کر چکا ہے، اس کا پہلا فرض یہ ہے کہ اللہ سے توبہ کرے اور اس حرام فعل سے رک جائے

اس کے بعد دوسرا فرض اس پر یہ ہے کہ حتی الامکان اس کی تلافی کرے۔ اگر اس نے مرے ہوئے آدمی کی غیبت کی ہو تو اس کے حق میں کثرت سے دعائے مغفرت کرے اگر کسی زندہ آدمی کی غیبت کی ہو تو اور وہ خلاف واقعہ بھی ہو تو ان لوگوں کے سامنے اس کی تردید کرے جن کے سامنے وہ پہلے بہتان تراشی کر چکا ہے۔ اور اگر سچی غیبت کی ہو تو آئندہ پھر کبھی اس کی برائی نہ کرے اور اس شخص سے معافی مانگے جس کی اس نے برائی کی تھی۔ علماء کا ایک گروہ کہتا ہے کہ معافی صرف اس صورت میں مانگنی چاہیئے جبکہ اس شخص کو اس کا علم بھی ہو چکا ہو ورنہ توبہ پر اکتفاء کرنا چاہیئے، کیونکہ اگر وہ شخص بے خبر ہو اور غیبت کرنے والا معافی مانگنے کی خاطر اسے بتائے کہ میں نے تیری غیبت کی تھی تو یہ چیز اس کے لئے اذیت کا موجب ہو گی۔

گالی گلوج

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ
سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوْقٌ وَ قِتَالُہٗ کُفْرٌ۔ (بخاری ومسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسلمان کو گالی دینا بڑا گناہ ہے اور اس سے جنگ کرنا کفر ہے۔

تشریح: مسلمان اس سے بہت بلند ہے کہ وہ کسی سے لڑائی جھگڑا کرے۔ اگر کسی بات پر غصہ آجائے اور لڑنے جھگڑنے کی نوبت آجائے تو بھی اسلامی تہذیب سے وہ آگے نہ بڑھے یعنی اپنے مقابل کو گالی نہ دے کیونکہ گالی دینا انتہائی گندی اور بیحیائی کی بات ہے۔ نیز اس سے بات بجائے ختم ہونے کے اور بڑھتی ہے کیونکہ انسان گالی کو برداشت نہیں کر پاتا۔ اس لئے آپ نے مسلمانوں کو اس سے روکا اور بتایا کہ مومن کو گالی دینا بڑا گناہ ہے اور اس سے جنگ کرنا تو کفر کے ہم معنی ہے۔ ایک مرتبہ آپ

نے اپنے ساتھیوں سے دریافت فرمایا کہ اس سے بھی زیادہ کوئی بُرا اور بدتمیز ہو سکتا ہے
جو اپنے ماں باپ کو گالی دے؟ آپ کے ساتھیوں نے یہ سن کر کہا اے حضور صلی اللہ
علیہ وسلم بھلا ایسا کون نالائق ہوگا جو اپنے ماں باپ کو گالی دے گا۔ آپ نے فرمایا کہ
جب دو شخص آپس میں لڑتے ہیں تو اُن میں سے ایک آدمی دوسرے کو گالی دیتا
ہے وہ اس کے جواب میں گالی دینے والے کو ماں باپ کی گالی دیتا ہے، اس طرح گویا
اس نے اپنے ماں باپ کو گالی دی، اگر یہ گالی نہ دیتا تو وہ بھی جواب میں اسے ماں باپ
کی گالی نہ دیتا۔ آپ کے ساتھیوں نے سمجھ لیا اور مان گئے کہ بیشک گالی دینا یا دلوانا خود
گالی دینے کے برابر ہے۔ اس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جھگڑے اور فساد کی جڑ کو
ہمیشہ کے لئے کاٹ دیا۔ کیونکہ جب نہ کوئی کسی کو گالی دے گا اور نہ بُرا بھلا کہے گا تو
لڑائی کیونکر ہوگی۔

بہت بولنا

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
مَنْ سَکَتَ سَلِمَ وَ مَنْ	جو خاموش رہا وہ سلامت رہا اور جو سلامت
سَلِمَ نَجَا۔ (بخاری)	رہا نجات پاگیا۔

تشریح: ظلم و فساد، لڑائی اور جھگڑے کے اسباب میں سے ایک سبب
زبان ہے۔ جو بات اٹھتی ہے اس کی جڑ زبان ہی ہوتی ہے۔ اس لئے حضور صلی اللہ
علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ زبان کو قابو میں رکھو۔ بلا ضرورت نہ بولو۔ جو بول بولو تول کر
بولو، تاکہ بعد میں شرمندگی نہ اُٹھانی پڑے، یا باہم لڑائی اور فساد کا سبب نہ بن جائے۔
پس ایک مسلمان کو لازم ہے کہ اپنی زبان کو قابو میں رکھے، ہر وقت بلا وجہ بک بک نہ کرتا
رہے۔ اگر زبان کی اصلاح ہوگئی تو سمجھئے کہ سارے جھگڑے اور فتنے ختم ہوگئے۔ ہم جو

بات بھی زبان سے نکالیں نیک اور اچھی نکالیں ورنہ خاموش رہیں۔ کیونکہ بُرے اور سخت بول سے چپ رہنا ہی بہتر ہے۔ چپ رہنے میں سلامتی اور امن ہے۔ چُپ رہنے سے عزت رہتی ہے۔ ہر مشکل اور ہر ذلت سے انسان بچ جاتا ہے۔ آخرت میں بھی اس کی وجہ سے پوچھ گچھ کم ہوگی۔ یہ تو معلوم ہی ہے کہ دو فرشتے جن کا نام کراماً کاتبین ہے ہماری ہر بات کو نامۂ اعمال میں درج کرتے ہیں۔ جب ہم چُپ رہیں گے تو وہ کچھ نہ لکھ سکیں گے۔ اس طرح ہم نہ جانے کتنی برائیوں سے جو محض زبان کی بدولت ہوتی رہتی ہیں بچ جائیں گے۔ دُنیا میں بھی ہمیں راحت وسکون ملے گا اور آخرت میں بھی نجات نصیب ہوگی۔

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ ایک بڑے پائے کے صحابی ہیں اُن سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے معاذ زبان کو قابو میں رکھو، کیونکہ بہت سے لوگ دوزخ میں محض زبان کی وجہ سے جائیں گے۔ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص اپنی شرمگاہ اور زبان کی حفاظت کرے تو میں اس کے لئے جنت کا ذمہ دار ہوتا ہوں۔ آپ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص بدکاری اور بے حیائی سے بچا رہے اور زبان سے کسی کو تکلیف نہ دے۔ غیبت نہ کرے۔ چغلی نہ کھائے، جھوٹ نہ بولے۔ بکواس نہ کرے اور جب بات کرے اسلامی ادب کا لحاظ رکھے تو وہ شخص جنتی ہوگا۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو اُسے چاہیئے کہ وہ بات کہے ورنہ خاموش رہے۔ یہی نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔ یعنی اس شخص کے ہاتھ سے کسی مسلمان کو تکلیف نہ پہونچے اور نہ کسی کی بات سے۔ اور یہ اسی وقت ممکن

ہے جب آدمی سوچ سمجھ کر بات کرے اور کوئی ایسی بات منھ سے نہ نکالے جو اللہ کو ناپسند اور اس کے بندوں کو تکلیف دینے والی ہو۔ جو شخص بہت زیادہ لغو باتیں کرتا ہے وہ اللہ اور بندوں دونوں کو ناراض کرتا ہے۔

وعدہ خلافی اور عہد شکنی

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا اِيْمَانَ لِمَنْ لَّا اَمَانَةَ لَهٗ وَ لَا دِيْنَ لِمَنْ لَّا عَهْدَ لَهٗ (بیہقی مشکوٰۃ) — جو امانتدار نہیں وہ مومن نہیں اور جو بعہد ہے اس کا کوئی عہد نہیں۔

تشریح: اسلام میں وعدہ کے پورا کرنے اور امانت کی حفاظت کی بڑی تاکید آئی ہے۔ کیونکہ اس سے محبت بڑھتی ہے۔ دنیا میں امن وامان ہوتا ہے۔ اور وعدہ خلافی، بے ایمانی اور خیانت کی وجہ سے باہمی میل جول، محبت والفت میں فرق آتا ہے۔ دنیا میں فتنہ وفساد برپا ہوتا ہے جو اللہ کو بہت ناپسند ہے۔ اس لئے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو امانتدار نہیں وہ مومن نہیں۔

امانت صرف روپیہ پیسہ، مال واسباب ہی میں نہیں ہوتی، بلکہ ہر چیز میں ہوتی ہے مثلاً کسی نے اپنے راز کی بات کہی اور کہا کہ اس کا کسی کو علم نہ ہو اسے اپنے تک محدود رکھنا اور یہ بات آپ کے پاس امانت ہے۔ پھر آپ نے ذکر کر دیا تو یہ خیانت ہوگی۔ اس حدیث کی رُو سے آپ بے ایمان ٹھہریں گے۔" اگر آپ کو کسی نے کوئی ذمہ داری سپرد کی اور آپ نے صحیح طور پر اُسے انجام نہ دیا تو یہ بھی خیانت ہے۔ اگر آپ سے کسی نے کوئی مشورہ لیا اور آپ نے اسے صحیح مشورہ نہیں دیا تو یہ بھی خیانت ہے، اسی طرح جو لوگ روزانہ کاروبار میں، لین دین میں، خرید وفروخت

ہیں جھوٹ بولتے اور وعدہ خلافی کرتے ہیں وہ اس حدیث کی روشنی میں اپنا جائزہ لیں اور جو وعدہ کریں سوچ سمجھ کر کریں، پھر اُسے پورا کریں، ورنہ خطرہ ہے کہ قیامت کے دن ان سے جواب طلب کیا جائے اور انھیں اس کی سزا بھگتنی پڑے۔ کیونکہ جب کوئی امانت میں خیانت کرتا ہے تو پھر اُن کے تعلقات اچھے نہیں رہتے، بدنامی بھی ہوتی ہے اور بے اعتمادی بھی؛ اسی طرح جو وعدہ خلافی کرتا ہے تو باہمی تعلقات پر بُرا اثر پڑتا ہے اور تعلقات ختم ہوجاتے ہیں۔ پس جن باتوں سے محبت اور مروّت میں فرق آتا ہو وہی لڑائی جھگڑے کا سبب بن جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اس چیز کو جو فتنہ و فساد کا سبب بنے منع کردیا ہے اور صاف صاف بتادیا ہے کہ جو کوئی ایسا کام کرے گا جس سے امن و سکون غارت ہوتا ہو، وہ مومن نہیں ہے۔ بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ بدعہدی اور بے ایمانی سے فتنہ و فساد پھیلتا ہے بلکہ اس کا سب سے بڑا نقصان خود اس شخص کو پہونچتا ہے جو بدعہدی اور بے ایمانی کا ارتکاب کرتا ہے۔ جو شخص بے ایمانی اور بدعہدی کا عادی بن چکا ہو اس کا دل بالآخر ایمان سے خالی ہوجاتا ہے اور اپنی خواہشات و مفادات کے سوا اس کا کوئی دِین نہیں ہوتا۔ وہ حقیقت کے اعتبار سے مومن نہیں منافق ہوتا ہے جس کا ظاہر کچھ ہوتا ہے اور باطن کچھ

عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " چار عادتیں ایسی ہیں کہ اگر وہ کسی شخص میں ہوں تو وہ خالص منافق ہوگا۔ اور اگر ان میں سے کوئی ایک خصلت کسی میں ہو تو اس میں نفاق کی خصلت ہوگی یہانتک کہ وہ اُسے چھوڑ دے۔ وہ خصلتیں یہ ہیں کہ جب امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے، جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔ جب عہد کرے تو بدعہدی کرے اور جب کسی سے جھگڑا ہوجائے تو حق سے ہٹ جائے"۔

تکبر

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ اَحَدٌ فِیْ قَلْبِہٖ مِثْقَالُ حَبَّۃٍ مِّنْ خَرْدَلٍ مِّنْ کِبْرٍ۔ (ترمذی) — جس آدمی کے دل میں رائی کے برابر غرور ہوگا وہ جنت میں نہیں جائے گا۔

تشریح: تکبر یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا سمجھے اور دوسروں کو ذلیل و حقیر جانے۔ اس سے جو فساد اور بگاڑ پیدا ہوتا ہے وہ بیان سے باہر ہے تکبر کی بنیادی خرابیاں یہ ہیں:

(۱) حق قبول کرنے سے انکار، اللہ کی سب سے بڑی نعمت یعنی وہ روشنی جس سے ہم صحیح راستہ حاصل کرتے ہیں، متکبر اس سے محروم ہو جاتا ہے۔ وہ اسے قبول نہیں کرتا۔ اس ہدایت کے لانے والے انبیاء علیہم السلام کو جھٹلاتا ہے اور ان کا مذاق اڑاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی برائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

وَالَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ قُلُوْبُہُمْ مُّنْکِرَۃٌ وَّہُمْ مُّسْتَکْبِرُوْنَ۔ (پ۱۴ رکوع ۹) — جو لوگ آخرت کے برحق ہونے پر ایمان نہیں لاتے ان کے دل (حق کے) منکر ہیں اور وہ تکبر کرنے والے ہیں۔

ایسا انسان بعض اوقات حق کو زبان سے قبول بھی کر لیتا ہے مگر اس کا دل اللہ کے آگے جھکنے، اس کی بندگی اختیار کرنے اور اس کے احکام کی پیروی کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ اللہ کی بندگی کا اس کے سوا کوئی مطلب نہیں کہ انسان اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کا انتہائی عاجز اور حقیر بندہ جانے اور انتہائی عاجزی کے ساتھ اس کے حضور جھک جائے اور مغرور و متکبر انسان یہی نہیں کر سکتا۔

(۲)۔ متکبر کے اندر خود غرضی اور انسان دشمنی پیدا ہوجاتی ہے کیونکہ وہ اپنے کو بڑا سمجھنے کی وجہ سے دوسروں کے لئے وہ چیز پسند نہیں کرتا جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔ اس کے اندر رشک وحسد اور اپنے برابر والے کو نیچا دکھانے کے لئے ہر شیطانی چال چلنے کی بُری عادتیں پیدا ہوجاتی ہیں۔ کسی کی نصیحت کی پروا نہیں کرتا۔ کیونکہ اس سے اس کی بڑائی کو ٹھیس لگتی ہے۔ اس کی یہی بڑائی کا غرور اسے انسانیت سے دور کردیتا ہے اور اس میں بے شمار بُرائیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔

(۳)۔ غرور کرنے والا اللہ کی محبت اور مدد سے محروم ہوجاتا ہے۔ دُنیا میں نفرت اور آخرت میں عذاب اس کے لئے مقدر ہوجاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا " بڑائی ہماری چادر ہے اور بزرگی ہمارا اِزار، جو کوئی انھیں میرے بجائے اپنے لئے پسند کرے گا اسے جہنم میں ڈالوں گا اور اسے پلٹ کر بھی نہ دیکھوں گا۔

حقیقت یہ ہے کہ بزرگی اللہ ہی کے لئے ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہیگا اور جس کی ذات حسن وجمال اور خوبی وکمال کا سرچشمہ ہے اور جو انسان سمیت پوری کائنات کا خالق، مالک اور پروردگار اور حاکم ہے۔ نہ کہ انسان کے لئے جو ایک ایک چیز میں اللہ کا محتاج ہے اور اس کا اپنا کچھ بھی نہیں۔ اس خطرناک اور موذی مرض کی عام شکلیں پانچ ہیں:

(۱) حسب ونسب کا غرور، تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ خاندان کے خاندان اسی حسب ونسب کے تفاخر کی زد میں آکر برباد ہوچکے ہیں۔ یہ فلاں ابن فلاں کا غرور آج بھی پورے شباب پر ہے اور اسی کے سبب ایک انسان دوسرے انسان سے نفرت کرتا ہے۔ حالانکہ انسان کی حقیقت اس سے کچھ زیادہ نہیں ہے کہ وہ ایک ناپاک حقیقت بوند سے پیدا کیا گیا ہے اور گندے راستے سے نکلا ہے اور گندگی کھا کر

پلا بڑھا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی عربی کو کسی عجمی پر، اور کسی گورے کو کسی کالے پر کوئی برتری نہیں۔ تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے"۔

(۲) ۔ حُسن وجمال کا غرور ۔ یہ مرض عورتوں میں بہت پایا جاتا ہے ۔ آپس کی دشمنی۔ لڑائی جھگڑا، رشک وحسد اس کے کڑوے پھل ہیں ۔ حالانکہ یہ حُسن وجمال چار دن کی چاندنی ہے ۔ بڑھاپا حُسن وجمال کو خاک میں ملا دیتا ہے ۔ خود اپنی پیدائش پر غور کرے تو یہ نعمت ان کے لئے نعمت بن سکتی ہے ۔ کتنے پھول ہم روزانہ دیکھتے ہیں جو کمھلا کر گر پڑتے ہیں ۔ انسان ہر روز اس قسم کے نمونے دیکھتا ہے ۔ آج ایک شخص کو حسن و صحت حاصل ہے کل یہ نعمت اس سے چھن جاتی ہے لیکن افسوس کہ انسان اس سے نصیحت حاصل نہیں کرتا ۔

(۳) دولت وعزت کا غرور ۔ انسان کے پاس یہ مال ودولت ، اولاد ۔ باغات اور جائداد ، نوکر چاکر اور عیش وعشرت کے سامان ہوتے ہیں ، تو انسان سمجھتا ہے کہ اب اس سے بڑا کوئی نہیں ۔ جب مال کی طرف دیکھتا ہے تو انسان سمجھتا ہے کہ یہ ہمیشہ اپنے قبضہ اور اختیار میں رہے گا ۔ یہ اولاد ہمیشہ ہر موقع پر ہماری مدد کرے گی ، باغات اور جائداد میں کبھی کمی نہ ہوگی ۔ تو یہ چیزیں انسانوں کو تکبر اور غرور میں مبتلا کر دیتی ہیں حالانکہ انسان کی دولت چھن سکتی ہے ، اُسے چور چُرا سکتا ہے ، کاروبار میں گھاٹا ہو سکتا ہے ۔ الغرض سارے آرام وراحت کے سامان ایک سکنڈ میں ختم ہو سکتے ہیں ۔ مال واولاد پر فخر وغرور کرنے والے یہودیوں کی تاریخ اس کا بڑا عبرتناک نمونہ ہے ۔

(۴) ۔ قوت وحکومت کا غرور ۔ قوت اور زور پر تکبر اور فخر نری نادانی ہے ، حکومت

واقتدار پر گھمنڈ اور فخر کرنا اس سے زیادہ ناسمجھی کی بات ہے اور یہ اختیارات تو چلتی پھرتی چھاؤں ہے آج اِس کے پاس، کل اُس کے پاس۔ اگر یہ خاص گروہ، جماعت یا فرد کے پاس ٹھہری رہتی تو البتہ کسی قدر غرور کی بات تھی اگرچہ اس وقت بھی اُس کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ کوئی مکڑی اپنے جالے پر ناز کرے۔ موت تو کسی کو نہیں چھوڑتی، خواہ وقت کا فرعون ہو یا معمولی گھاس کھودنے والا۔

(۵)۔ علم و زہد کا غرور۔ بعض لوگ جنہیں اللہ علم کی دولت سے نوازتا ہے اور جو اپنے اس علم پر عمل کی توفیق پاتے ہیں بعض اوقات غرور میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور یہ غرور ان کے علم و زہد کو ڈبو کر رکھ دیتا ہے۔ علم کی اصل حقیقت یہ نہیں ہے کہ انسان نے بہت سی کتابیں پڑھ لی ہیں اور اس کے پاس اونچی اونچی ڈگریاں ہیں۔ بلکہ علم کی اصل حقیقت یہ ہے کہ انسان کو اللہ کی عظمت اور بزرگی اور اپنی بندگی اور بیچارگی کا احساس ہو، اسے ہر دم اللہ کی گرفت کا اندیشہ ہو، اسے یہ فکر کھائے جاتی ہو کہ معلوم نہیں اس کا انجام کیا ہوگا اور اس کا علم اس کے لئے منفعت بخش ہوگا یا وبال۔ ایسا انسان علم و تقویٰ کے بلند ترین مدارج پر پہونچنے کے بعد کبرِ نفس میں مبتلا نہیں ہوتا، اور نہ کسی انسان کو حقیر جانتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کی عاقبت کا دار و مدار خاتمہ پر ہے اور کسی کو نہیں معلوم کہ کس انسان کا خاتمہ کس حالت پر ہوگا۔ وہ جتنا علم و تقویٰ میں بڑھتا جاتا ہے اتنا ہی اللہ کی عظمت و بزرگی کے آگے سرنگوں ہوتا ہے، اپنی کم مائیگی اور بے چارگی کا شدید احساس کرتا ہے اور اتنا ہی دوسرے انسانوں کے ساتھ عاجزی کا رویّہ اختیار کرتا ہے۔

مختصر یہ کہ علم و زہد اور کبر و غرور یک جا نہیں ہو سکتے۔ اگر کوئی شخص عالم و زاہد ہوتے ہوئے مغرور اور متکبر ہو تو حقیقت کے اعتبار سے نہ وہ عالم ہے نہ زاہد۔

نام و نمود

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ ۔ (بخاری مسلم) عملوں کے (ثواب کا) دارومدار نیتوں پر ہے

تشریح : اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کو یہ ہدایت کی ہے کہ مسلمان کی نیت بہت پاک اور نیک ہونی چاہیئے ۔ کیونکہ تمام عملوں کا بدلہ نیت کے مطابق ہی ملے گا ۔ ایک کام جو کسی نے کیا ہو بہت نیک ہو اور ساری دنیا کے لوگ بھی اسے نیک ہی کہتے اور سمجھتے ہوں مگر کام کرنے والے کی نیت نیک نہ ہو تو اسے جان لینا چاہیئے کہ اُسے اس نیک کام کا ثواب نہیں ملے گا ۔ مثلاً ایک آدمی صدقہ کرتا ہے مسجد بنواتا ہے ، سرائے بنواتا ہے مگر دل میں اللہ کی رضا جوئی کا جذبہ ہونے کے بجائے اپنی شہرت اور نام آوری مقصود ہے تو اسے ثواب نہیں ملے گا کیونکہ اجر اور ثواب تو نیت پر موقوف ہے ۔ لہٰذا ہر مسلمان کو چاہیئے کہ ہر نیک کام سے پہلے اپنی نیت کو درست کرے اور جو نیک کام بھی کرے صرف اللہ کی رضا اور آخرت کی کامیابی کیلئے کرے ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حقیقت کو واضح کرتے ہوئے فرمایا : اللہ تعالےٰ تمہاری صورتوں اور تمہاری دولت کو نہیں دیکھتا ، وہ تو تمہارے دلوں اور اعمال کو دیکھتا ہے ۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تھوڑا دِکھاوا بھی شرک ہے ۔ ایک اور موقع پر آپ نے نام و نمود کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا :

"جس شخص نے دِکھاوے کے لئے نماز پڑھی اس نے شرک کیا ، جس نے دکھاوے کے لئے روزے رکھے اس نے شرک کیا ، اور جس نے دکھاوے کے لئے خیرات کی اس نے شرک کیا " ۔ ان احادیث سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی نیک کام دکھاوے کے لئے

کیا جائے تو نہ صرف یہ کہ اس کے کرنے والے کو اجر نہیں ملتا بلکہ یہ نیک کام بہت بڑا گناہ بن جاتا ہے، اس کی بُرائی شرک کے برابر ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ توحید اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسان صرف اللہ کا بندہ اور صرف اس کی رضا کا طلب گار رہو۔ اور شرک کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی بندگی اور اس کی رضا جوئی میں کسی کو شریک کیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن ایک ایسے شخص کو خدا کی عدالت میں حاضر کیا جائے گا پھر خدا اُسے اپنی سب نعمتیں یاد دلائے گا اور اسے وہ سب نعمتیں یاد آجائیں گی۔ تب پوچھے گا کہ تو نے میری نعمتیں پاکر کیا کام کئے؟ وہ عرض کرے گا کہ میں نے تیری خوشنودی کی خاطر (تیرے دین سے لڑنے والوں کے خلاف) جنگ کی یہاں تک کہ میں نے اپنی جان دیدی۔ خدا اس سے کہے گا تو نے یہ بات غلط کہی کہ میری خاطر جنگ کی۔ تو نے تو صرف اس لئے جنگ کی کہ لوگ تجھے جری اور بہادر کہیں، سو دُنیا میں تجھے اس کا بدلہ مل گیا، پھر حکم ہو گا کہ اسے کو مُنہ کے بَل گھسیٹتے ہوئے لے جاؤ اور جہنم میں ڈال دو۔ چنانچہ اس کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔" پھر ایک دوسرا شخص خدا کی عدالت میں پیش ہو گا۔ جو عالم وقاری ہو گا، خدا اسے اپنی نعمتیں یاد دلائے گا اور اسے سب نعمتیں یاد آجائیں گی، تب اس سے کہے گا کہ ان نعمتوں کو پاکر تو نے اس کا کیا حق ادا کیا؟ وہ عرض کرے گا خدایا! میں نے تیری خاطر تیرا دین سیکھا اور تیری خاطر دوسروں کو اس کی تعلیم دی اور تیری خاطر قرآن مجید پڑھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا تم نے جھوٹ کہا، تم نے تو اس لئے علم سیکھا تھا کہ لوگ تمہیں عالم کہیں اور قرآن اس غرض سے تم نے پڑھا تھا کہ لوگ تمہیں قرآن کا جاننے والا کہیں، سو تمہیں دُنیا میں اس کا صلہ مل گیا۔ پھر حکم ہو گا اس کو چہرے کے بل گھسیٹتے ہوئے لے جاؤ اور جہنم میں پھینک دو۔ چنانچہ اسے گھسیٹتے ہوئے لے جا کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔" اور تیسرا آدمی وہ ہو گا

جس کو اللہ نے دنیا میں کشادگی بخشی تھی، اور ہر قسم کی دولت سے نوازا تھا ایسے شخص کو اللہ کی جناب میں حاضر کیا جائے گا اور وہ اسے اپنی سب نعمتیں یاد دلائے گا، وہ ساری نعمتوں کو جان لے گا اور اقرار کرے گا کہ ہاں یہ سب نعمتیں اسے دی گئی تھیں۔ تب اس سے اس کا رب پوچھے گا کہ میری نعمتوں کا تو نے کیا حق ادا کیا؟ وہ جواب میں عرض کریگا جن جن مدات میں خرچ کرنا تیرے نزدیک پسندیدہ تھا سب ہی مدات میں تیری خوشنودی کے لئے میں نے خرچ کیا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو نے جھوٹ کہا۔ تو نے یہ سارا مال اس لئے لٹایا تھا کہ لوگ تجھے سخی کہیں، سو یہ لقب تجھے دنیا میں مل گیا۔ پھر حکم ہو گا کہ اس کو چہرے کے بل گھیٹتے ہوئے لے جاؤ اور جہنم میں ڈال دو، چنانچہ اسے جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔" غور فرمائیے! اپنے اپنے مقام پر تینوں نے نیک عمل کئے مگر تینوں کے اعمال بے کار ثابت ہوئے۔ کیونکہ ان لوگوں نے خلوص اور صاف نیت سے اپنے اپنے کام نہیں کئے تھے، اس لئے بجائے اچھا اجر پانے کے اُلٹے سزا کے مستحق ہوئے۔"

غصہ وغضب

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَجُلًا قَالَ لِلنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَوْصِنِیْ۔ قَالَ لَا تَغْضَبْ، فَرَدَّدَ مِرَارًا۔ قَالَ لَا تَغْضَبْ۔ (بخاری)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص (جاریہ بن قدامہ) نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ مجھے نصیحت فرمائیے، آپ نے فرمایا غصہ نہ کرو۔ انھوں نے کئی بار یہی سوال کیا اور ہر بار آپ نے یہی جواب دیا کہ غصہ نہ کرو۔"

تشریح: انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے طبعی طور پر جو قوتیں رکھی ہیں ان میں ایک اہم قوت، قوت غضبیہ ہے۔ یہی قوت انسان کو جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت

اور دشمنوں سے بچاؤ پر آمادہ کرتی ہے۔ اسی قوت کے ذریعہ وہ خدا کے باغیوں سے جہاد کرتا اور نافرمانی کرنے والوں پر شریعت کی مقرر کردہ حدیں نافذ کرتا ہے۔ جب بات یہ ہے تو پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نصیحت و وصیت کا مفہوم کیا ہوگا؟

یہاں دو باتیں سمجھنے کی ہیں۔ ایک تو یہ کہ "غصہ نہ کرو" کی ممانعت آیا بالکل مطلق اور عام ہے یا اس نہی کا تعلق کسی خاص چیز سے ہے؟ دوسری یہ کہ تکلیف دہ، اور ناخوشگوار صورت حال میں غصہ طبعاً آتا ہے اور اس کو روکنے پر انسان قادر نہیں ہے۔ تو پھر ایک طبعی چیز سے روکنے کا مقصد کیا ہے؟

پہلی بات کا جواب یہ ہے کہ غصہ کی ممانعت مطلق اور عام نہیں ہے بلکہ مقید اور خاص ہے۔ اس کا تعلق دنیوی امور اور اپنے نفس کے ایسے حقوق سے ہے جن کا اثر دوسروں پر نہیں پڑتا۔ حقوق اللہ کی ادائیگی، باغیوں سے جہاد، حدود و قصاص کا نفاذ، ظالموں کے مقابلہ میں جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت، ازالۂ منکرات اور اسی طرح کے دوسرے دینی امور سے غصہ کی ممانعت کا تعلق نہیں ہے۔ ایسے مواقع پر (شرعی حدود کے اندر) قوت غضبیہ کا استعمال محمود بلکہ ضروری ہے۔ اس معاملہ میں بھی ہمارے لئے اُسوۂ حسنہ اور نمونہ وہی ذات گرامی ہے جس نے "غصہ نہ کرو" کی نصیحت فرمائی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حال یہ تھا کہ اپنی ذات کے لئے آپ نے نہ کسی پر کبھی غصہ کیا اور نہ انتقام لیا، لیکن دینی امور میں صحابۂ کرام اور ازواجِ مطہرات کی نگاہوں نے چہرۂ مبارک کے جمال میں غصہ کا جلال بھی دیکھا ہے۔ یہاں زیر بحث حدیث کی توضیح کے لئے یہ بات محض اشارۃً کہی گئی ہے، ورنہ سیرت نبوی کا یہ باب بھی ایک مستقل اور وسیع باب ہے۔

دوسری بات یہ تھی کہ ایک طبعی چیز سے ممانعت کا مقصد کیا ہے؟ محدثین نے

اپنے فہم وذوق کے مطابق اس سوال کے چار جوابات دیئے ہیں، اور ان میں کا ہر ایک جواب اپنی جگہ صحیح ہے:

(۱)۔ غضب نہ کرو کا مقصد یہ ہے کہ غیظ وغضب کے اسباب سے اجتناب کرو اور کسی ایسی چیز سے تعرض نہ کرو جس سے غصہ پیدا ہوتا ہو۔

(۲)۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ کبر وغرور سے پرہیز کرو، کیونکہ غصہ کی آگ کو بھڑکانے والے اسباب میں دوسروں کو اپنے مقابلہ میں حقیر وپست اور اپنے کو دوسروں کے مقابلہ میں بہتر وبلند سمجھنے کا جذبہ بہت بڑا سبب ہے۔

(۳)۔ غصہ جن افعال واقوال کا تقاضا کرتا ہے ان سے احتراز کرو۔

(۴)۔ غصہ آنے کے بعد ہر ایسے اقدام سے بچو جس سے خدا ورسول نے روک دیا ہے

تیسرے اور چوتھے جواب میں محض تعبیر کا فرق ہے ورنہ بات ایک ہی ہے۔ اس مختصر توضیح کے بعد اب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس وصیت ونصیحت پر غور کیجئے تو محسوس ہوگا کہ لَا تَغْضَبْ کا ایک جملہ اپنے اندر ایک کتاب چھپائے ہوئے ہے۔ دراصل نفس انسانی کی ایک عظیم قوت پر قابو پانے اور اسے دائرہ اعتدال میں رکھنے کی نصیحت ہے کیونکہ یہ قوت اگر معتدل رہے تو انسان کے لئے بڑے خیر وصلاح کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ اور اپنی حدود سے تجاوز کرے تو اس کے لئے شر وفساد کا انتہائی خطرناک سبب بن سکتی ہے۔ اس وقت دنیا کو قتل وغارت اور بدامنی کا جہنم بنانے میں اس قوت کی بے لگامی کو جتنا دخل ہے وہ اہل نظر سے مخفی نہیں ہے۔

انفرادی طور پر یوں تو ہر مسلمان اس وصیت نبوی کا مخاطب ہے لیکن ایک داعیٔ حق سے غصہ نہ کرو کی مخاطبت عام مسلمانوں سے بھی زیادہ ہے عام مسلمانوں کا ذاتی معاملات میں غصہ کرنا ان [illegible]ات کو یا کسی دنیاوی مفاد کو نقصان پہونچانا ہے

اور دعوت اسلامی کی راہ میں داعئ حق کا اشتعال اور غصہ اس دین کو نقصان پہونچاتا ہے جسے پھیلانے کا داعیہ اس کے دل میں ہے۔ شیطان دنیاوی معاملات میں غصہ دلانے کی جتنی سعی کرتا ہے دعوت اسلامی کی راہ میں اس کی یہ کوشش ہزار گونہ بڑھ جاتی ہے اس لئے داعئ حق کو ہر وقت اس سے چوکنا رہنا چاہیئے۔

غصہ سے بچنا جس قدر انفرادی زندگی کو خطرات اور نقصانات سے بچانے کے لئے ضروری ہے اسی قدر بلکہ اس سے زیادہ اجتماعی زندگی کی حفاظت و بقا کے لئے لازمی ہے۔ کسی تنظیم یا ادارے کو چلانے اور ترقی دینے کے لئے مختلف تجویزیں، تدبیریں، پالیسیاں اور پروگرام سامنے آتے ہیں اور مقصد میں متحد ہونے کے باوجود اس کے افراد و ارکان اس سلسلہ میں مختلف رائے رکھ سکتے ہیں۔ اب اگر اس کے افراد و ارکان میں اختلاف رائے کو برداشت کی قوت نہ ہو بلکہ ایسے موقع پر وہ غیظ و غضب سے بھر جائیں، ایک دوسرے کو الزام دینے اور نیتوں پر حملے کرنے لگیں تو کھلی بات ہے کہ وہ تنظیم و ادارہ ترقی تو کیا کرے گا شکار انتشار ہونے سے بھی نہیں بچ سکتا۔ اور اگر معاملہ کسی دینی تنظیم یا دینی ادارے کا ہو تو اس شیطانی حربے یعنی غصہ سے بچاؤ اور زیادہ ضروری ہو جاتا ہے کیونکہ دنیوی تنظیمیں یا ادارے تو لڑ جھگڑ کر اور ان کے افراد ایک دوسرے پر کرسیاں پھینک کر بھی کسی نہ کسی طرح کام چلا لیتے ہیں، لیکن جہاں معاملہ صرف دین و اخلاق کا ہو تو وہاں یہ صورت حال اس اخلاق اور اس دین ہی کو رسوا کر کے رکھ دے گی جسے پھیلانے اور سربلند کرنے کے لئے جماعت کی تشکیل عمل میں آئی تھی۔

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

لَيْسَ الشَّدِيْدُ بِالصُّرَعَةِ، اِنَّمَا الشَّدِيْدُ الَّذِي يَمْلِكُ نَفْسَهٗ عِنْدَ الْغَضَبِ۔	پہلوان وہ نہیں جو کشتی میں لوگوں کو پچھاڑ دے۔ پہلوان وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے نفس پر قابو پائے۔ (بخاری)

تشریح: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمّت کو اس بات کی طرف متوجہ کیا ہے کہ اندرونی دشمن نفس سے جنگ، اس پر کنٹرول اور اس کو شکست، بیرونی دشمنوں کو پچھاڑنے اور ان پر غالب آنے سے زیادہ سخت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غصہ پر قابو حاصل کرنے والے کو کشتی کے پہلوان سے زیادہ قوی انسان اور حقیقی معنی میں پہلوان قرار دیا ہے۔ اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا ہر وقت مشاہدہ ہوتا رہتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بڑے بڑے پہلوان غصہ کے وقت اپنے نفس پر قابو پانے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔

اس حدیث سے ایک طرف غصہ پر قابو حاصل کرنے کی اہمیت معلوم ہوتی ہے اور دوسری طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت کا ڈھنگ بھی معلوم ہوتا ہے آپ کی تعلیم و تربیت کا ایک عام انداز یہ بھی تھا کہ صحابہ کرام سے بہت سے دنیوی امور کے بارے میں سوالات کیا کرتے تھے۔ اور پھر جواب سُن کر اُن کے ذہن کو دینی و اُخروی اُمور کی طرف پھیر دیتے تھے۔ ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ چلتے پھرتے روزانہ کے واقعات میں سے کسی واقعہ کو دینی تعلیم و تربیت کا ذریعہ بنا لیتے تھے۔

<u>غصہ پر قابو پانے کی تدابیر</u>: غصہ چونکہ ایک طبعی چیز ہے اس لئے تکلیف دہ، اور ناپسند خاطر صورت حال میں بے اختیار آتا ہے۔ انسان کو قدرت حاصل نہیں ہے کہ وہ اس کو آنے سے روک دے۔ اوپر گذر چکا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ممانعت کا مقصد بھی یہ نہیں ہے کہ اس طبعی شئے پر قدغن لگائی جائے بلکہ غرض یہ ہے کہ اس

اس کے اثرات پر قابو حاصل کیا جائے اور غصہ آنے کے بعد ایسی حرکات سرزد نہ ہوں جو ظلم و زیادتی قرار پائیں اور شریعت کی نگاہ میں ناروا ثابت ہوں۔ یہ چیز انسان کی قدرت کے اندر ہے اور وہ مناسب تدابیر اختیار کرے تو غصہ پر قابو حاصل کر سکتا ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر قابو پانے کی متعدد تدابیر بتائی ہیں۔ ذیل میں الگ الگ انھیں لکھا جارہا ہے:

فضیلت اور ثواب کا استحضار: - امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی "صحیح" میں "غضب سے احتراز" کا جو باب باندھا ہے اس کی ابتدا ذیل کی دو آیتوں سے کی ہے:

وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبَآئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَاغَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ۔

اور جو لوگ بڑے گناہوں اور بے حیائی سے بچتے ہیں اور جب ان کو غصہ آتے معاف کر دیتے ہیں۔

دوسری یہ آیت ہے:

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ط وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ۔ (پ۴ رکوع ۵)۔

جو خوشی اور غم میں خرچ کرتے ہیں، جو غصے کو پی جاتے ہیں۔ اور جو لوگوں کے قصور معاف کر دیتے ہیں۔ اور اللہ ایسے نیک بندوں کو پسند کرتا ہے۔

یہ آیتیں بتاتی ہیں کہ غصہ آنے کے بعد غصہ دلانے والے کو معاف کر دینا اور غصہ کو پی جانا ایمان اور تقویٰ کی صفت ہے۔ کیونکہ سورۂ شوریٰ کی آیت میں مومنوں کی صفات شمار کی گئی ہیں اور سورۂ آل عمران کی آیت میں متقیوں کی۔ معلوم ہوا کہ مومن و متقی وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنی ذات کے لئے انتقام نہیں لیتے۔ بلکہ وہ

عالی ظرف ہوتے ہیں اور قصور کرنے والوں کو معاف کر دیتے ہیں۔ اس طرح یہ احساس وشعور غصہ پر قابو پانے اور پی جانے کی ایک مستقل اور دائمی تدبیر بن جاتا ہے۔ اوپر جو حدیث گذری وہ بھی کظمِ غیظ (غصہ پی جانا) کی فضیلت پر دلالت کرتی ہیں۔ یہاں دو حدیثیں مزید نقل کی جاتی ہیں:

سَهْلِ بْنِ مَعَاذٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ كَظَمَ غَيْظًا وَهُوَ يَسْتَطِيعُ أَنْ يُنَفِّذَهُ دَعَاهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلٰى رُؤُسِ الْأَشْهَادِ حَتّٰى يُخَيِّرَهُ فِي أَيِّ الْحُورِ شَاءَ۔ (ترمذی۔ ابوداؤد)

سہل بن معاذ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، آپ نے فرمایا، جس شخص نے غصہ کو پی لیا حالانکہ اسے قدرت تھی کہ اپنے غصہ کو نافذ کر دے (یعنی غصہ دلانے والے سے بدلہ لے) تو قیامت میں اللہ تعالیٰ اسے مجمع عام میں بلائے گا، یہانتک کہ وہ اختیار دیگا کہ جس حور کو چاہے پسند کرے۔

مجمع عام میں بلانا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اسے خلق خدا کے سامنے ایک محترم و مکرم ہستی کی طرح پیش کیا جائے گا کہ دیکھو یہ وہ بندہ ہے جس نے خدا کو خوش کرنے کے لئے اپنے نفس سے مجاہدہ کیا، غصہ پر قابو پایا اور قدرت رکھنے کے باوجود قصوروار کو معاف کر دیا۔ "جس حور کو چاہے پسند کرے" اس فقرے کا مفہوم یہ ہے کہ میدانِ حشر میں اس کی عزت افزائی کے بعد نہ صرف یہ کہ اسے جنت میں داخل کیا جائے گا بلکہ وہاں بلند درجات عطا کئے جائیں گے۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَا زَادَ اللّٰهُ عَبْدًا بِعَفْوٍ إِلَّا عِزًّا وَ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: معاف کرنے کے صلہ میں اللہ بندے کی عزت میں اضافہ ہی

مَا تَوَاضَعَ اَحَدٌ اِلَّا رَفَعَہٗ ۔ کرتا ہے اور جو بھی اللہ کے لئے تواضع اختیار کرتا ہے اللہ اُس کو بلند کر دیتا ہے ۔ (مسلم جلد ۲)

اس حدیث میں جو جامع لفظ اختیار کئے گئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ عفو و تواضع دنیا اور آخرت دونوں جگہ انسان کو عزت و رفعت عطا کرتے ہیں ۔ قرآن و حدیث میں نیکیوں کے اجر کا ذکر اس لئے آیا ہے کہ خدا کے بندے ادھر مائل ہوں اور خوشدلی کے ساتھ انھیں اختیار کریں ۔ غصہ پی جانے اور معاف کرنے کا یہ اجر اگر ذہن میں تازہ ہو تو غصہ آنے کے بعد اس پر قابو پالینا آسان ہو جائے گا ۔

شیطان سے استعاذہ : غصہ پر قابو پانے کی دوسری حقیقی اور مستقل تدبیر شیطان سے استعاذہ ہے :

سُلَیْمَانُ بْنُ صُرَدٍ قَالَ اِسْتَبَّ رَجُلَانِ عِنْدَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَنَحْنُ عِنْدَہٗ جُلُوْسٌ فَاَحَدُ ھُمَا سَبَّ صَاحِبَہٗ مُغْضَبًا قَدْ اِحْمَرَّ وَجْھُہٗ ، فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنِّیْ لَاَعْلَمُ کَلِمَۃً لَوْ قَالَھَا لَذَھَبَ عَنْہُ مَایَجِدُ ، لَوْ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ ، فَقَالُوْا لِلرَّجُلِ اَلَا تَسْمَعُ مَایَقُوْلُ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنِّیْ

سلیمان بن صرد کہتے ہیں " ہم لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے کہ دو شخص جھگڑنے لگے ان میں سے ایک نے اپنے ساتھی کو غصہ میں گالی دی ، اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا ۔ یہ دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے ایک ایسا کلمہ معلوم ہے کہ اگر وہ اسے کہہ دے تو وہ کیفیت دور ہو جائے جسے وہ محسوس کر رہا ہے ۔ اگر وہ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ کہہ لے ۔ (تو غصہ دور ہو جائے) ۔ لوگوں نے اس شخص سے کہا ، کیا تم وہ بات نہیں سُن رہے ہو جو نبی

لَسْتُ بِمَجْنُوْنٍ۔ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں، اس نے جواب میں کہا میں پاگل نہیں ہوں"۔ (بخاری کتاب الادب)

بعض محدثین کا خیال ہے کہ غصہ کو رفع کرنے کا سب سے قوی اور زود اثر علاج توحید حقیقی کا استحضار ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر شیطان سے استعاذہ کی جو تعلیم دی ہے وہ اسی استحضار کی ایک تدبیر ہے۔ بے جا غصہ شیطان کے اغوا سے پیدا ہوتا ہے اور اس کے شر سے بچانے والی ذات صرف خدا کی ہے۔ اس موقع پر انسان جب اپنے آپ کو شیطان کے شر سے خدا کی پناہ میں دیدیتا ہے تو شیطان اس طرح غائب ہو جاتا ہے جس طرح آفتاب کی روشنی سے تاریکی غائب ہو جاتی ہے استعاذہ کرنے والے کی زبان سے جیسے ہی شعور کے ساتھ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ کا کلمہ نکلتا ہے وہ اپنے آپ کو ایک ایسی طاقت کی پناہ میں پاتا ہے جس کے اقتدار کی گرفت سے کائنات کی کوئی چیز باہر نہیں ہے۔ وہ اپنے معاملہ کو خدا کے سپرد کر دیتا ہے اور غیظ و غضب کی بجلیاں سرد پڑ جاتی ہیں۔

جس شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کو قبول نہیں کیا اور جواب میں یہ کہا کہ میں پاگل نہیں ہوں اس کے بارے میں محدثین کا خیال ہے کہ وہ یا تو کوئی منافق تھا یا کوئی ناتربیت یافتہ دیہاتی۔ اس کے اس جواب سے یہ سبق ملتا ہے کہ شدت اختیار کرنے سے پہلے ہی غصہ پر قابو پا لینے کی فکر کرنی چاہیئے ورنہ خطرہ ہے کہ غصہ کی شدت ذہنی توازن کو بگاڑ دے اور پھر کوئی تدبیر کارگر نہ ہو۔

سکوت:۔ اگر کسی حرکت یا اس کی گفتگو سے غصہ پیدا ہو تو سب سے پہلے تدبیر یہ ہے کہ اس سلسلۂ کلام کو چھوڑ کر انسان خاموش ہو جاتے اور مخاطب کی بات کا جواب نہ دے۔

عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَفَعَهٗ وَاِذَا غَضِبَ اَحَدُكُمْ فَلْيَسْكُتْ وَاِذَا غَضِبَ اَحَدُكُمْ فَلْيَسْكُتْ ۔ (احمد)	ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو اسے خاموش ہوجانا چاہیئے۔ یہ بات آپ نے تین بار فرمائی۔

وضو: غصہ پر قابو پانے کی حقیقی اور واقعی تدبیر تو یہی ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی عظمت وکبریائی اور اس کے اقتدار اعلیٰ کو نگاہ میں رکھے، شیطان سے پناہ مانگے اور اس فضیلت واجر کو حاصل کرنے کی سعی کرے جو اللہ نے غصہ پی جانے والوں اور معاف کر دینے والوں کے لئے مقرر فرمایا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ احادیث میں ہمیں ایسی تدابیر بھی ملتی ہیں جو غصہ کے وقت کی حالت بدل دینے کی وجہ سے خارجی اور نفسیاتی طور پر موثر ہوتی ہیں، ان میں کی ایک تدبیر "سکوت" کا ذکر اوپر گذرا، اور دوسری تدبیر وضو ہے۔ ابو وائل کہتے ہیں کہ ہم لوگ عروہ بن محمد سعدی کے پاس گئے ان سے ایک شخص نے گفتگو کی اور انھیں غضبناک کر دیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور انھوں نے وضو کیا پھر یہ حدیث بیان کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "کہ غصہ شیطان کا اثر ہے اور شیطان آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور آگ پانی سے بجھائی جاتی ہے۔ تو جب تم میں سے کسی شخص کو غصہ آئے تو اسے وضو کر لینا چاہیئے۔

حالت کی تبدیلی: ۔ غصہ کی حالت پیدا ہوتے ہی اگر اس وقت کے حال میں تبدیلی پیدا کر لی جائے تو اس کا بھی اچھا نفسیاتی اثر مرتب ہوتا ہے۔

اَبُوْ ذَرٍّ رَفَعَهٗ اِذَا غَضِبَ اَحَدُكُمْ وَهُوَ قَائِمٌ فَلْيَجْلِسْ، فَاِنْ ذَهَبَ عَنْهُ الْغَضَبُ وَاِلَّا	حضرت ابوذر نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کی ہے کہ حضور نے فرمایا جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے اس حال میں کہ وہ کھڑا ہو تو اسے بیٹھ

فَلْيَضْطَجِعْ ۔ بیٹھ جانا چاہیئے، اگر غصہ دفع ہو جائے تو ٹھیک ہے ورنہ اسے لیٹ جانا چاہیئے۔ (ابوداؤد)

ان احادیث کا ماحصل یہ ہے کہ غصہ پر قابو پانا ایمان و تقویٰ کی تکمیل کے لئے ایک ضروری کام ہے۔ اگر کوئی مسلمان اپنے غصہ پر قابو حاصل نہیں کرتا تو وہ ایک داعیٔ اسلام بننے کی صلاحیت کھو دیتا ہے اور دوسری طرف اپنے آپ کو دُنیا و آخرت کے نقصانات و خطرات کا ہدف بنا لیتا ہے۔

تفرقہ اندازی

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ تَفَرَّقَ فَلَيْسَ مِنَّا۔ جو شخص آپس میں (مسلمانوں میں) تفرقہ اور جدائی ڈالے وہ ہم میں سے نہیں۔ (طبرانی)

تشریح: اُمت کو اتحاد و اتفاق کے ساتھ زندگی گذارنے کی ہدایت کی جا رہی ہے آپس میں ایک ہو کر رہنا، تفرقہ نہ ڈالنا۔ اس سے اُمت کا شیرازہ بکھر جاتا ہے اور اُمت مٹ جاتی ہے۔ یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تفرقہ اندازی کو ایک ہولناک جرم ہی قرار نہیں دیا بلکہ اس جرم کے مرتکب کو اسلام سے خارج کر دیا ہے کیونکہ یہی وہ جرم ہے جس سے مسلمانوں کا شیرازہ بکھر جاتا ہے اور قوم کو سخت نقصان پہونچتا ہے۔ پس جو شخص خود اپنی ہی قوم کا دشمن ہو اور اسے تباہ و برباد کرنے کے درپے ہو پھر وہ کس طرح اس کا رکن رہ سکتا ہے۔ آج کتنے مسلمان ہیں جو تفرقہ اندازی کو ایک معمولی چیز سمجھتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر مسلمانوں کو لڑاتے ہیں اور ان میں پھوٹ ڈلواتے ہیں اور اپنا مفاد حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مذہبی رنگ میں مسلمانوں

کو لڑا کر اور ایک دوسرے کے خلاف ورغلا کر انھیں جُدا کر دیا جاتا ہے۔ یہ بڑا عظیم جرم ہے۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ — حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِیَّاکُمْ وَالْخُصُوْمَاتِ فِی الدِّیْنِ — دین کی باتوں میں لڑائی جھگڑا نہ کرو، اس سے بچو۔

(دیلمی)

تشریح: سوچ سمجھ کا اختلاف ایک فطری اور قدرتی چیز ہے۔ اسلام نے ایسے اختلاف کی پوری آزادی دی ہے بشرطیکہ یہ اختلاف رائے نیک نیتی، اخلاص، اور سنجیدگی، پیار و محبت کے جذبے سے بھرپور ہو۔ بلکہ ایسی رائے کے اختلاف کو رحمت و برکت قرار دیا گیا ہے۔ ہاں وہ اختلاف جو آپس میں لڑانے کا سبب ہو وہ اسلام کی نگاہ میں بہت بُرا اور بڑا گناہ ہے۔ اور اس حدیث میں ایسے ہی رائے کے اختلاف سے بچنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اس وقت آپ جو ایک ہی دین کے ماننے والوں میں فرقہ بندی، عصبیت، ضد، لڑائی، جھگڑے، ایک دوسرے پر گندگی اچھالتے ہوئے دیکھ رہے ہیں دراصل اسی جذبہ خبیث کا نتیجہ ہے جس سے اسلام نے روکنے کی کوشش کی ہے۔ ورنہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانہ میں ایک دو نہیں متعدد جزئی مسئلوں میں رائے کا اختلاف رہا مگر ان میں نہ پارٹی بنی، نہ فرقہ بندی ہوئی، ہر ایک دوسرے کا احترام کرتا، مسائل پر سوچ و چار کا آزادانہ حق دیتا اور ہر ایک اپنے علم و تحقیق کے مطابق جس نتیجہ پر پہونچتا اس پر عمل کرتا اور دوسروں کو بھی اس کی طرف دعوت دیتا، اور جس بات کو وہ حق اور ٹھیک جانتا اس کے حق اور صحیح ثابت کرنے پر زور بھی صرف کرتا مگر جہاں اس کو اپنی کمزوری محسوس ہوتی فوراً اس کو مان لیتا۔ اس حدیث کی روشنی میں آج بھی صحابہ کرام کی طرح سب کو جزئی مسائل

میں اپنے علم کے مطابق عمل کرنے کا حق تسلیم کر لیا جائے اور کسی کو بُرا نہ کہا جائے تو یہ سارے فسادات اور جھگڑے ختم ہو سکتے ہیں۔

قول بلا عمل

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
اِنَّمَا اَخَافُ عَلٰى هٰذِهِ الْاُمَّةِ
كُلَّ مُنَافِقٍ يَتَكَلَّمُ بِالْحِكْمَةِ
وَيَعْمَلُ بِالْجَوْرِ۔ (بیہقی، مشکوٰۃ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
میں اس اُمت پر منافق کا خطرہ محسوس کرتا
ہوں جو باتیں تو حکمت و دانائی کی کرے لیکن
عمل میں ظلم و حق ناشناسی کا رویہ اختیار کرے۔

تشریح: اس حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت پر آنے والے بعض خطرات کی نشاندہی فرمائی ہے جن کا آپ کو سب سے زیادہ خطرہ تھا، اور وہ خطرہ یہ تھا کہ اُمت کی رہنمائی ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آجائے جو باتوں اور تقریروں میں تو علم و حکمت اور دانائی و ہوشمندی کی باتیں کرتے ہوں لیکن ان کا عمل علم و حکمت کے اثرات سے محروم اور حق ناشناسی اور ظلم و جور پر مبنی ہو۔

ایسے لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "بدباطن" اور منافق قرار دیا ہے جو شیریں تقریر و تحریر پر قادر ہوں اور عوام کو اپنے بیان سے مدہوش کر سکیں اور اپنی جادو بھری تحریر کے ذریعہ سننے والے اور پڑھنے والوں پر عقلمند ہونے کا رعب قائم کر دیں۔ لیکن جہاں عمل کا تعلق ہے ان کا کردار حکمت و اخلاق سے عاری ہو۔

بلاشبہ یہ دورنگی اس بات کا ثبوت ہے کہ جو کچھ انھوں نے کہا وہ اُن کے دل کی آواز نہیں تھی۔ جس دینداری اور خدا ترسی کا وہ منبر اور اسٹیج پر اظہار کرتے تھے وہ ایک نمائش تھی جس سے بھولے بھالے عوام پر علم و حکمت کے موتی بکھیریں اور خدا ترسی و

حق شناسی کا درس دیں مگر ان کا عمل علم و حکمت کے اثرات سے محروم، حق ناشناسی خدا فراموشی اور ظلم و جور سے پُر ہو۔ اپنی خطابت اور ذہانت کا رعب بٹھانا مقصود تھا۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ جن خوبیوں کی تلقین وہ دوسروں کو کرتے ہیں وہ خود انھیں اختیار نہ کرتے اور جن بداخلاقیوں سے عوام کو روکتے تھے خود اُن کے مرتکب کیوں ہوتے؟

علم و عمل اور ظاہر و باطن کا یہ کھُلا تضاد ہے جسے نفاق کہا جاتا ہے۔ جو ہر اعتبار سے بُرا ہے۔ لیکن اس کی سب سے خطرناک صورت یہ ہے کہ ایسے لوگ اُمت کے سربراہ بن جائیں۔ کھلی بات ہے کہ جب بدکردار اور منافق لوگ کسی قوم کے سربراہ بن جائیں تو اس قوم کی تباہی میں کوئی کسر باقی نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ آخرت میں ایسے سربراہوں کا انجام بڑا دردناک ہوگا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "قیامت کے دن ایک آدمی لایا جائیگا اور اسے جہنم کی آگ میں ڈال دیا جائے گا تو اس کی آنتیں نکل کر باہر آجائیں گی اور آگ میں تیزی سے پھیلنے لگیں گی۔ تو وہ اپنی نکلی ہوئی آنتوں سمیت آگ میں اس طرح چکر کاٹے گا جیسے چکی چلانے والا گدھا چکی کے ارد گرد چکر کاٹتا رہتا ہے دوزخی لوگ اس کے گرد جمع ہوجائیں گے اور کہیں گے جناب! آپ کا یہ کیا حال ہے؟ کیا آپ ہمیں نیکی کا حکم نہیں کرتے تھے؟ اور برائی سے نہیں روکتے تھے؟ وہ شخص کہے گا میں تم کو نیکیوں کا حکم کرتا تھا لیکن انھیں خود اختیار نہیں کرتا تھا۔ اور تمہیں برائیوں سے روکتا تھا مگر خود برائیوں کا ارتکاب کرتا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات سے معلوم ہُوا کہ قول و عمل کا تضاد دُنیا و آخرت دونوں میں مہلک ہے۔ خصوصاً ان لوگوں کے لئے جو دین کی خدمت کرتے ہوں۔ ایسے لوگ اگر قول و عمل کے تضاد میں مبتلا ہوں گے تو وہ خود بھی ہلاک

ہوں گے اور اسلام اور اُمت مسلمہ کو بھی تباہ کر کے چھوڑیں گے۔

ہر مسلمان کی یہ ذمہ داری ہے کہ اپنی زندگی کو قول وعمل کے تضاد سے پاک کرے اور اپنی اور اُمت مسلمہ کی باگ ڈور ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں نہ رہنے دے جو قول وعمل کے تضاد میں مبتلا ہوں اور ان کا باطن ان کے ظاہر سے مختلف ہو۔

تجارت

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْاَمِيْنُ مَعَ	جو تاجر بڑا سچا اور بڑا امانت دار ہو وہ
النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ	قیامت کے دن نبیوں، صدیقوں اور
(ترمذی)	شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔

تشریح: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو تجارت پر بہت اُبھارا ہے اور اس کی بڑی ترغیب دی ہے۔ خود جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تجارت کی تھی اور اکثر صحابہ کرام بھی تجارت ہی کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ" دنیا میں جتنے پیشے ہیں اگر ان سب میں اللہ کی برکت تسلیم کی جائے تو ننانوے حصے برکت تجارت میں ہے اور ایک حصہ باقی کاروبار میں۔ اس سے اندازہ لگائیے کہ اسلام میں تجارت کی کتنی اہمیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے مسلمانوں کو تجارت کی بہت ترغیب دی ہے اور اس پر اُبھارا ہے کہ وہ تجارت کریں۔ آپ نے نہ صرف اس پر لوگوں کو آمادہ کیا بلکہ تجارت کے اصول اور ڈھنگ بھی بتائے کہ تجارت کس طرح کرنی چاہیئے اور اس کے گُر بھی بتائے۔ اس کے حلال اور حرام کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی، نفع اور نقصان کی تمام صورتیں الگ الگ تفصیل

کے ساتھ بیان فرمائیں۔ چنانچہ مندرجہ بالا حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سچے اور امانتدار تاجر کی فضیلت بیان فرمائی ہے۔

یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ تجارت کی کامیابی کا راز ساکھ میں مضمر ہے اور ساکھ کا دارومدار تاجر کی سچائی اور ایمانداری پر ہے۔ تاجر جس قدر سچا اور ایماندار ہوگا اسی قدر اس کی تجارت کو فروغ ہوگا۔ مغربی ممالک کی تجارت کی کامیابی کا راز یہی ہے کہ وہ تجارت میں کامیابی اور ساکھ قائم کرنے کے لئے سختی کے ساتھ سچائی اور ایمانداری کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ لیکن مسلمان کو سچائی اور ایمانداری اس غرض کے لئے اختیار کرنے کے بجائے اللہ کی رضا اور آخرت کی کامیابی کے لئے اختیار کرنا چاہیئے۔ یہ الگ بات ہے کہ ضمناً اس سے تجارت کو فروغ بھی نصیب ہوگا اور اس کی ساکھ قائم ہوگی۔

مندرجہ بالا حدیث سے معلوم ہوا کہ راست باز اور ایماندار تاجر کو جنّت میں انبیاء، صدیقین، اور شہیدوں کی رفاقت نصیب ہوگی۔ کتنا بلند مقام ہے راستباز اور ایماندار تاجر کا۔

دولت اور اُس کا صحیح مصرف

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
يَقُوْلُ الْعَبْدُ مَالِيْ مَالِيْ وَاِنَّ	میرا مال میرا مال۔ حالانکہ اس کے مال میں سے سچ
مَالَهٗ مِنْ مَالِهٖ ثَلَاثٌ، مَا اَكَلَ	مچ اس کا مال تین طرح کا ہے جو اس نے کھایا اور ختم کر دیا
فَاَفْنٰى، اَوْ لَبِسَ فَاَبْلٰى اَوْ اَعْطٰى	یا پہنا اور پرانا کر دیا۔ یا اللہ کی راہ میں دیا (اور
فَاقْتَنٰى وَمَا سِوٰى ذٰلِكَ فَهُوَ	اللہ کے یہاں) جمع کر دیا اور جو اس کے سوا ہے آپ
ذَاهِبٌ وَتَارِكُهٗ لِلنَّاسِ۔ (مسلم)	لوگوں کے لئے چھوڑ جانے والا ہے۔“

تشریح : دولت میں انسان کے لئے بڑی کشش ہے۔ وہ مصیبتیں جھیل کر اپنے آپ کو خطرات میں ڈال کر اور دن رات ایک کر کے جائز اور ناجائز ہر طریقہ سے دولت کماتا ہے اور پھر اُسے جوڑ جوڑ کر رکھتا ہے، اس کی خواہش اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس کی تجوری میں اگر آج ایک ہزار روپئے ہیں تو کچھ دنوں کے بعد ایک لاکھ ہوجانے چاہئیں۔ اور اگر ایک لاکھ ہے تو کچھ عرصہ کے بعد ایک کروڑ ہوجائے وَعَلیٰ ھٰذا القیاس۔ وہ سمجھتا ہے کہ دُنیا کا سب سے بڑا کمال دولت کو جا بیجا ہر طریقہ سے کمانا اور اسے سینت سینت کر رکھنا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی ذہنیت کی اصلاح کی ہے۔ آپ نے یہ واضح فرمایا کہ انسان کی دولت فی الواقع وہ نہیں ہے جو اس کی تجوری یا بینک میں پڑی ہوئی ہے بلکہ وہ ہے جو انسان کے کام آگئی۔ جو کچھ اس نے جائز طریقہ سے کھایا اور جو کچھ اس نے جائز طریقہ پر پہنا اور جو کچھ بھی اچھے اور بھلے کاموں میں لگایا وہ اس کے کام آگیا اور حقیقتاً وہی اس کا ہوگیا۔ اس کے سوا جو دولت اس نے غلط کاموں میں خرچ کی تھی وہ تو ضائع ہو ہی گئی، جس دولت کو وہ سینت سینت کر رکھ رہا ہے اور جس خزانہ پر وہ سانپ بنا بیٹھا ہے وہ بھی ضائع ہونے والا ہے۔ ایک دن آئے گا جب اُسے موت آجائے گی اور اس دولت کو وہ دوسرے انسانوں کے لئے چھوڑ کر چلا جائے گا جو اس کی دولت کو جا بیجا اُڑا کر ختم کر دیں گے۔ یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ اس کی یہ دولت اس کے وارثوں ہی کو ملے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ وارث منہ دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں اور دوسرے لوگ اس کی جائداد پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ انسان کے پاس تھوڑی سی عقل ہو تو وہ بآسانی یہ سمجھ سکتا ہے کہ اس کی دولت وہی ہے جو اس کے کام آگئی۔ اس کے سوا جو کچھ ہے وہ اس کا نہیں ہے دوسروں کا ہے۔ اس کے سلسلہ میں وہ خواہ مخواہ جان،

مال، آبرو کا خطرہ مول لے رہا ہے۔ جو لوگ دولت خرچ کرنے کے قائل ہیں وہ یہ بھی خیال کرتے ہیں کہ دولت کا صحیح مصرف یہ ہے کہ وہ اس کے اور اس کے گھر والوں کے کام آئے۔ نیک کاموں میں خرچ کرتے ہوئے ان کا دل تنگی محسوس کرتا ہے اور اگر کچھ پیسے راہ خدا میں خرچ کرنا پڑتے ہیں تو ان کے بارے میں ان کا تصور یہ ہوتا ہے کہ یہ پیسے ضائع ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی ذہنیت کی اصلاح کرتے ہوئے فرمایا کہ جو پیسہ انسان کے کھانے پینے اور دوسری ضروریات میں لگ گیا اگرچہ وہ بھی انسان کے کام آ گیا مگر دولت کا سب سے عمدہ مصرف یہ ہے کہ اسے خدا کو راضی کرنے کے لئے نیک کاموں میں لگایا جائے۔ کیونکہ جو پیسہ اس کے گھر والوں کی ضروریات میں صرف ہوا وہ ختم ہو گیا لیکن جو پیسہ اللہ کی رضا کے لئے نیک کاموں میں لگایا گیا وہ اللہ کے بینک میں جمع ہو گیا جس کا سیکڑوں اور ہزاروں گنا بدلہ اُسے دنیا و آخرت میں ملے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حقیقت کو ایک دوسرے انداز میں بیان فرمایا۔ آپ نے صحابہ کرام سے پوچھا تم میں سے کون ہے جسے اپنے وارثوں کا مال اپنے مال سے زیادہ عزیز ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں نے جواب دیا " اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کوئی شخص ایسا نہیں ہے جسے اپنا سرمایہ اپنے وارثوں کے سرمایہ سے زیادہ محبوب اور عزیز نہ ہو" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: " انسان کا مال بس وہی ہے جو اس نے (راہِ خدا میں خرچ کر کے اللہ کے یہاں) اپنے سے آگے بھیج دیا (جو آخرت میں اس کے کام آئے گا) اور اس کے وارثوں کا مال وہ ہے جسے وہ دُنیا میں اپنے پیچھے چھوڑ کر چلا گیا" ایک اور موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا:

"کعبہ کے رب کی قسم وہی لوگ دیوالئے اور تباہ و برباد ہیں، حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ نے سوال کیا اے اللہ کے رسول آپ پر میرے ماں باپ قربان ہوں کون لوگ تباہ و برباد ہیں؟ آپ نے فرمایا جن کے پاس بہت زیادہ دولت ہے سوائے ان لوگوں کے جو اس دولت کو (اللہ کو راضی کرنے کے لئے نیک کاموں میں) اپنے آگے پیچھے، دائیں بائیں خوب لٹائے۔"

حقیقت یہ ہے کہ معاشی، سماجی اور اخلاقی تمام پہلوؤں سے بہت سی خرابیوں کی جڑ دولت کا سمیٹ سمیٹ کر رکھنا اور غلط جگہوں پر اس کا صرف ہونا ہے اگر دولت جائز طریقہ سے کمائی جائے اور سمیٹ سمیٹ کر رکھنے کے بجائے مفید اور نیک کاموں میں خرچ کی جاتی رہے تو نہ صرف یہ کہ خرچ کرنے والے کی آخرت کامیاب ہوگی اور اس کی دنیا بھی کامیاب ہوگی اور اس کے ساتھ وہ سماج بھی معاشی، معاشرتی اور اخلاقی پہلو سے ترقی کریگا جس سے وہ وابستہ ہے۔

اسی بات کو ایک اور موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح فرمایا:

"اے ابن آدم جو دولت تیری ضرورت سے زائد ہے اگر تو اسے (راہ خدا) میں خرچ کرے گا تو یہ تیرے لئے بہتر ہوگا، اور تو اسے سمیٹ سمیٹ کر رکھے گا تو یہ تیرے لئے برا ہوگا۔ اور ضروریات کے بقدر رکھنے پر کوئی ملامت نہیں ہے۔ اور خرچ کرنے میں ان لوگوں سے ابتدا کر جن کی ذمہ داری تیرے اوپر آتی ہے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دو شخص ہیں جن پر رشک کیا جانا چاہیئے۔ ایک وہ شخص جسے اللہ نے دولت بخشی ہو اور اسے یہ توفیق دی ہو کہ وہ اسے راہ حق میں لٹائے۔ دوسرا وہ شخص جسے اللہ نے علم و حکمت سے نوازا ہو تو اس کے ذریعہ انسانوں کے معاملات کا فیصلہ کرتا اور اس علم کو عام کرتا ہے۔"

نکاح

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِیْ فَمَنْ رَغِبَ
عَنْ سُنَّتِیْ فَلَيْسَ مِنِّیْ۔ (مشکوٰۃ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
نکاح کرنا میرا طریقہ ہے تو جو کوئی میرے طریقہ
سے روگردانی کرے اس کا تعلق مجھ سے نہیں ہے

تشریح: اسلام جنسی آوارگی اور انارکی کو انتہائی بُری نظر سے دیکھتا ہے۔ اور پاکدامنی اور عفت وعصمت اور پاکیزگی پر انتہائی زور دیتا ہے۔ اس لئے وہ فطری تقاضوں کی تسکین کے لئے ایک بہترین اصول اور قانون پیش کرتا ہے تاکہ تمام مسلمان اس کے تحت ایک پاکیزہ اور شریفانہ زندگی گذاریں اور فحاشی اور بے حیائی کے قریب بھی نہ پھٹکیں۔ قرآن نے ان لوگوں کو جن کی شادی ہو چکی ہے ان کو اور شادی شدہ عورت کو "محصنہ" کہا ہے۔ مُحصن، حِصن سے بنا ہے جس کے معنی قلعہ کے ہیں۔ آدمی جب نکاح کرتا ہے تو گویا وہ عزت وعفت اور عصمت کا قلعہ تعمیر کرتا ہے اور اس عفت مآب قلعہ میں اپنے کو اور اپنی بیوی کو محفوظ کرتا ہے

اسلام کا یہ تصورِ زندگی بجز نکاح کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح پر زور دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ جو شخص قدرت رکھتے ہوئے نکاح نہیں کرتا اور بال بچوں کے جھمیلوں میں پھنسنے کو نیکی اور خدا پرستی کے خلاف سمجھتا ہے وہ مسلمان ہی نہیں ہے۔ اسلام تجرد کی زندگی کو پسندیدہ نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ وہ مومنین کو حکم دیتا ہے کہ وہ نکاح کرنے کی کوشش کریں۔ نکاح انسان کو گناہوں سے بچاتا ہے۔ اور نکاح سے ایمان محفوظ رہتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ:

"اے نوجوانو! تم پر نکاح کرنا لازم ہے، اس لئے کہ نکاح آنکھوں کے گناہ سے بچاتا ہے۔ اس سے انسان کی عزت وعصمت محفوظ رہتی ہے، ہاں جب تک کوئی مناسب رشتہ نہ ملے یا قدرت نہ ہو تو روزے رکھو۔ روزے رکھنے کی وجہ سے جنسی خواہش کم ہوگی اور تم گناہ سے بچے رہو گے۔ ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا قدرت ہوتے ہوئے اگر کوئی نکاح نہ کرے تو وہ مسلمان نہیں ہے۔

چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کو اپنی سنت قرار دیا ہے اس لئے نکاح آپ کی سنت کے مطابق ہی ہونا چاہیئے۔ سنت کے مقابلہ میں برادری کے رسم ورواج کو ترجیح دے کر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضی مول نہ لے۔ اسلام میں نکاح کی جو اہمیت ہے اور بدکاری کی جو قباحت ہے وہ اوپر گذر چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں نکاح کو انتہائی آسان اور بدکاری کو انتہائی مشکل بنا دیا ہے۔ بدکاری پر سو کوڑوں یا سنگ ساری کی سزا رکھی ہے۔ اس کے تصور ہی سے انسان لرز جاتا ہے۔ اور نکاح کی تقریب کو انتہائی سادہ، کم خرچ بلکہ بے خرچ بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام، تابعین عظام اور تبع تابعین کے دور میں جبکہ اسلام ٹھیک نافذ تھا بدکاری بہت مشکل تھی اور نکاح بہت آسان تھا۔ آج کل نکاح اور اس کی تقریبات پر اتنی رقم خرچ ہوتی ہے کہ اوسط درجہ کے آدمی کے لئے اتنی رقم فراہم کرنا آسان نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ لڑکے اور لڑکیاں لمبی عمر تک نکاح بغیر بیٹھے رہتے ہیں۔ اور سماج میں طرح طرح کی خرابیاں اور بدکاریاں پھیلتی ہیں۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ زندگی کے اور شعبوں کی طرح وہ نکاح اور شادی کے معاملہ کو بھی اسلامی تعلیمات کے مطابق بنائیں اور رسومات کے بندھنوں اور مصارف بے جا کے گراں بار سے بچا کر اس کو سادہ اور آسان بنائیں۔ ورنہ

نوجوان نسل جس پر ملت کے مستقبل کا دار و مدار ہے دینی، اخلاقی اور معاشرتی لحاظ سے تباہ ہو جائے گی اور اس کی ذمہ داری ان لوگوں پر آئے گی جو نکاح کو اسلامی تعلیمات کے مطابق بنانے پر تیار نہیں ہوتے۔

ایک اور چیز جس نے نکاح کو انتہائی مشکل اور غیر مفید بنا دیا ہے وہ یہ ہے کہ نکاح کے سلسلہ میں حسب و نسب کا خیال غیر معمولی طور پر کیا جاتا ہے۔ برادری سے باہر کوئی لڑکا یا لڑکی کتنی ہی دیندار ہو اس کے مقابلے میں اس لڑکے یا لڑکی کو ترجیح دی جائے گی جو اپنی برادری کا ہو خواہ وہ کیسا ہی ہو۔ یہی نہیں اگر برادری میں کوئی موزوں رشتہ نہ ملے تو لڑکی عمر بھر نکاح بغیر بیٹھی رہتی ہے۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ عورت سے نکاح اس کے حسب و نسب، مال و دولت، حسن و جمال اور دینداری کی بنیاد پر کیا جاتا ہے تو تم دیندار عورت کو حاصل کرو۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نکاح کے سلسلہ میں فیصلہ کن چیز دین ہے باقی چیزوں کا درجہ اس کے بعد ہے۔ یہی نہیں مسلمانوں میں یہ تصور عام ہے اور اس تصور کے پھیلانے میں علماء بھی شریک ہیں کہ مسلمانوں میں کچھ برادریاں اونچی ہیں اور کچھ نیچی ہیں، اور ان میں باہم نکاح، شادی صحیح نہیں ہے۔ یہ سراسر عجمی اور ہندوستانی تصور ہے اور اسلامی تعلیمات کے عین ضد۔ اسلام کی رُو سے سارے انسان ایک خدا کے بندے اور اس کے پیدا کئے ہوئے اور ایک جوڑے آدم و حوّا کی اولاد ہیں۔ نسب یا پیشہ کے اعتبار سے ان میں کوئی اونچ نیچ نہیں ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ	اے انسان! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور
ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا	ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہیں قبیلوں اور
وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ	خاندانوں کی شکل دیدی تاکہ تم ایک دوسرے کو

أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقٰكُمْ ۔ پہچان سکو ۔ بیشک تم میں زیادہ بزرگ اور شریف وہ ہے جو زیادہ خدا ترس ہے ۔ (پ ۲۶ رکوع ۱۳)

اور اسی بات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح فرمایا : کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی گورے کو کسی کالے پر کوئی برتری نہیں ، تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے ۔

اسلام نے جہاں لڑکے اور لڑکی دونوں کی مرضی اور اجازت کو نکاح کی اوّلین بنیاد قرار دیا ہے تاکہ زوجین خود اپنی مرضی سے اپنی ازدواجی زندگی کو خوشگوار بنانے کا فیصلہ کر لیں وہیں دونوں کو زندگی کے اس اہم ترین فیصلے کے لئے بالکل آزاد اور مطلق العنان بھی نہیں چھوڑ دیا ہے بلکہ نکاح کرانے اور لڑکی ، لڑکے کے درمیان ذمہ دار اور واسطہ بنا کر نکاح کے جملہ مراحل طے کرنے کے لئے " ولی " کی شرط کو بھی ضروری قرار دیا ہے کہ زوجین کی مرضی معلوم کرنے کے بعد عقد نکاح کے فرائض اپنی نگرانی میں انجام دے ۔ بغیر ولی کے نکاح ہوتا ہی نہیں اور نہ ہی عورت خود اپنا نکاح اپنے آپ کر سکتی ہے ۔ لڑکی کا ولی اس کا باپ ، دادا ، بھائی ، چچا ، ماموں وغیرہ ہو سکتے ہیں ۔ لڑکی اگر والدین اور ولی کی اجازت لئے بغیر خود کسی مرد سے سول میرج کر لے تو مسلمانوں کے عرف عام اور شریعت محمدیؐ کی اصلاحی روح کے خلاف ہونے کی وجہ سے نکاح باطل تصور ہوگا ۔ خواہ یہ نکاح کسی مسلم جج کی عدالت میں کیا گیا ہو ، یا پیشہ ور قاضی کے پاس ۔

جہاں تک زوجین کی مرضی کا سوال ہے وہ محض رشتہ کے انتخاب کی حد تک محدود ہے ۔ لیکن موجودہ مغربی تہذیب کی بے حیا رسم نکاح سے قبل لڑکی اور لڑکے کا باہمی اختلاط اور خلوت و جلوت میں دونوں کا بے تکلف ملنا سخت ممنوع اور حرام ہے ۔ لہٰذا لڑکی کی مرضی انتخاب کی حد تک ضروری ہے ، جیسا کہ

خنسا بنت خزام کی روایت ہے کہ ان کے ماں باپ نے ان کی مرضی کے بغیر شادی کر دی تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں تو آپ نے اس نکاح کو فسخ کرا دیا۔ عبداللہ بن عباس کی روایت ہے کہ ایک کنواری لڑکی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی، اس نے بیان کیا کہ اس کے باپ نے اس کی مرضی کے خلاف اس کا نکاح کر دیا ہے تو آپ نے اسے اختیار دیا کہ چاہے تو اس نکاح کو باقی رکھے اور چاہے تو ختم کر دے۔

ایک اور چیز جو نکاح کے مقصد کو مجروح کرنے والی ہے وہ یہ ہے کہ لڑکی کو چھپایا جاتا ہے اور لڑکا کا تو لڑکا۔ بہت سی برادریوں میں تو لڑکے کے خاندان کی خواتین بھی لڑکی کو دیکھ نہیں پاتیں۔ یہ بالکل غلط ہے۔ اور اس کا نتیجہ بہت خراب نکلتا ہے۔ نکاح ہو جانے کے بعد لڑکا جب لڑکی کو دیکھتا ہے اور وہ اسے ناپسند ہوتی ہے تو اسے یا تو طلاق دیدیتا ہے یا وہ اسے انتہائی تنگ کر کے رکھتا ہے۔ صحیح بات یہی ہے کہ لڑکے کے متعلق خواتین کو اس بات کا موقع ملنا چاہیئے کہ وہ لڑکی کو دیکھ بھال سکیں۔ بلکہ اسلامی تعلیمات کی رُو سے خود لڑکے کو اس بات کا حق ہے کہ وہ شادی سے پہلے لڑکی کو دیکھ لے۔ حق ہی نہیں حدیث کی رُو سے یہی بہتر ہے۔

مغیرہ بن شعبہ نے ایک عورت سے منگنی کی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا کیا تم نے اس عورت کو دیکھ لیا ہے؟ میں نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا اسے دیکھ لو کیونکہ یہ بات تم دونوں کے تعلقات کے لئے زیادہ مفید ثابت ہوگی۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم میں سے جب کوئی شخص کسی عورت سے شادی کا ارادہ کرے تو ان تمام چیزوں کو ضرور

دیکھ بھال لے جو نکاح کا باعث بنتی ہیں، یعنی عورت کی دینی، مالی، نسبی حالت اور اس کے حسن و جمال کے بارے میں اطمینان کرلے کہ وہ اس کے حسب منشا ہے یا نہیں؟ تاکہ شادی کے بعد ندامت نہ ہو۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ ایک مہاجر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے بیان کیا کہ میں نے انصار کی ایک عورت سے شادی کرنا طے کیا ہے آپ نے فرمایا اسے دیکھ لو کیونکہ انصار کی آنکھوں میں کچھ ہوتا ہے۔"

یہ تمام احادیث بتاتی ہیں کہ شادی کے مراحل میں نکاح سے پہلے ایک ایسا مرحلہ آنا چاہیئے جبکہ لڑکا لڑکی کو دیکھ سکے اور اس کی شکل و صورت کی طرف سے اطمینان کرسکے۔

طلاق

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَبْغَضُ الْحَلَالِ اِلَى اللّٰهِ الطَّلَاقُ — حلال چیزوں میں سب زیادہ ناپسند چیز

(ابوداؤد) — اللہ تعالیٰ کے نزدیک طلاق ہے۔

تشریح: عورت، مرد کے باہمی تعلق کو عقد (گرہ) اور نکاح کہتے ہیں۔ اور اس تعلق کے چھوڑ دینے اور کاٹ دینے کو طلاق کہتے ہیں۔ اس حدیث میں یہ بتایا گیا ہے کہ طلاق دینا اگرچہ جائز ہے مگر اللہ کو طلاق پسند نہیں ہے۔ بدرجہ مجبوری ہی اس چیز کو گوارا کیا جاسکتا ہے۔

اسلام میں نکاح کا جو طریقہ ہے اگر اس پر ٹھیک ٹھیک عمل کیا جائے تو شاید ہی طلاق کی نوبت آئے۔ نکاح کے بارے صحیح بات یہی ہے کہ لڑکے اور لڑکی کے بالغ ہونے کے بعد ہی کیا جائے۔ کمسنی میں بدرجہ مجبوری ہی کیا جانا چاہیئے۔ نکاح

سے پہلے لڑکا اور لڑکی کو ایک دوسرے کو دیکھنے کا موقع ملنا چاہیئے۔ نکاح دونوں کی مرضی سے ہونا چاہیئے۔ مہر اتنا مقرر کیا جائے کہ آسانی سے ادا کیا جا سکے۔ رشتے کے طے کرنے کے سلسلہ میں کیا چیز زیادہ اہمیت رکھتی ہے اس پر روشنی ڈالتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "عورت کا نکاح اس کے حسب ونسب، اس کی دولت وثروت، اس کے حسن وجمال اور اس کی دین داری کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ تم دیندار عورت کو حاصل کرو۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ رشتہ کے سلسلہ میں اصل فیصلہ کن چیز دینداری ہے۔ دوسری چیزوں کا بھی خیال رکھا جا سکتا ہے مگر دینداری کے بعد۔ اگر رشتہ میں دینداری کا خیال رکھا جائے تو میاں اور بیوی ایک دوسرے کا حق پہچانیں اور طلاق کی نوبت کم آئے۔

نکاح میں شغار کی صورت نہیں ہونی چاہیئے۔ یعنی یہ شرط نہ ہو کہ تم اپنا رشتہ مجھے دو تو میں تمہیں اپنا رشتہ دوں گا۔ اس طرح کے نکاحوں کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر ایک جوڑے کے تعلقات خراب ہو جاتے ہیں تو اس کا اثر دوسرے جوڑے کے تعلقات پر خواہ مخواہ پڑتا ہے۔

نکاح ہو جانے کے بعد میاں، بیوی دونوں کو ایک دوسرے کے حقوق کو ادا کرنا چاہیئے۔ مرد عورت کی ضروریات کا خیال رکھے اور انھیں ہر وقت پورا کرے اور اپنی بیوی سے نرمی، محبت اور خوش خلقی سے پیش آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم میں بہترین آدمی وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لئے بہترین ہو۔" اور عورت تمام جائز معاملات میں اپنے شوہر کا کہنا مانے اور دل وجان سے اس کی مرضی پوری کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اچھی بیوی کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا "مومن کے لئے اللہ کے تقوے کے بعد نیک بیوی سے بہتر کوئی چیز

نفع بخش نہیں ہے۔ اگر وہ حکم دے تو اس کا کہا مانے۔ اگر اسے دیکھے تو اسے خوش کر دے اور اگر وہ اس کے اعتماد پر کوئی قسم کھائے تو اسے پورا کر دے اور اس کی عدم موجودگی میں اپنی ذات اور شوہر کے مال و دولت کے بارے میں اس کی وفادار ہو۔ ان باتوں کا اگر خیال رکھا جائے تو ان شاء اللہ تعالیٰ طلاق کی نوبت نہیں آئیگی۔

میاں، بیوی کو اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ نکاح کے ذریعہ دو اجنبی اور مختلف المزاج افراد ایک دوسرے کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ میاں بیوی دونوں ایک دوسرے کے مزاج کو پہچانیں، ایک دوسرے کی کمزوریوں کو نظر انداز کریں اور خوبیوں کو نگاہ میں رکھیں۔ قرآن مجید میں ہے:

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ فَإِنْ	عورتوں کے ساتھ شرافت اور حسنِ سلوک کا رویہ
كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا	اختیار کرو۔ اگر وہ تمہیں (کسی پہلو سے) ناپسند ہو تو تم
شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا	اسے تنگ نہ کرو (کیونکہ) ہوسکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند
كَثِيرًا۔ (پ۴ رکوع ۱۴)	کرو اور اللہ نے اسمیں تمہارے لئے بڑی منفعت رکھدی ہو۔

مطلب یہ ہے کہ عورت کے کسی ایک ناقص پہلو سے متأثر ہو کر دل برداشتہ نہیں ہونا چاہیئے۔ نقص کس میں نہیں ہوتا۔ خامیوں کے بجائے اس کی خوبیوں پر نظر ہونی چاہیئے۔ امید ہے کہ اس طرح دونوں میں موافقت پیدا ہوگی اور طلاق کی نوبت نہیں آئے گی۔ اگر خدانخواستہ میاں بیوی کے تعلقات ناخوشگوار رہیں تو حکم ہے کہ پہلے گھر والے اس کی اصلاح کی کوشش کریں۔ اگر اصلاح نہ ہو سکے تو پھر ایک دو آدمی لڑکے کی طرف سے اور ایک دو آدمی لڑکی کی طرف سے جمع ہوں اور باہم مل کر کوئی ایسی صورت نکالیں کہ باہم صلح ہو جائے اور طلاق کی نوبت نہ آئے۔ اگر خدانخواستہ پھر بھی سمجھوتہ نہ ہو سکے اور طلاق ناگزیر ہو تو مرد ایک طلاق دیدے۔

ہندوستان میں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ طلاق تین طلاق دینے سے واقع ہوتی ہے۔ اسی لئے جب بھی طلاق دی جاتی ہے تو تین طلاقیں دی جاتی ہیں اور وہ بھی ایک ہی مجلس اور نشست میں۔ یہ طریقہ بالکل صحیح نہیں ہے۔ طلاق ہمیشہ ایک دینا چاہیے تاکہ اگر طلاق کے بعد فریقین رجوع کرنا چاہیں تو انھیں اس کا موقع رہ سکے۔ بیک وقت تین طلاق دینا غیر مسنون ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے نتیجہ میں بیشمار گھر تباہ ہوتے ہیں۔ یا لوگ رجعت کئے بغیر اس مطلقہ بیوی کو گھر میں ڈال رکھتے ہیں اور زندگی بھر بدکاری ہوتی رہتی ہے۔ یا حلالہ کا طریقہ اختیار کرتے ہیں جو غیرت کے منافی اور اسلامی تعلیمات کے بالکل خلاف ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حلالہ کرنے والے اور حلالہ کرانے والے دونوں پر لعنت بھیجی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک نشست میں تین طلاقیں دینے والے کو دُرّے مارا کرتے تھے اور اس سے فرماتے تھے کہ کیا اللہ کی کتاب سے مذاق کرنا ہے؟

نظم و اجتماعیّت

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
اِذَا کَانَ ثَلَاثَۃٌ فِیْ سَفَرٍ	جب سفر میں تین آدمی ہوں تو وہ اپنے میں
فَلْیُؤَمِّرُوْا اَحَدَھُمْ۔ (مشکوٰۃ)	سے ایک کو امیر بنالیں۔

تشریح: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ سفر کی حالت میں مسلمانوں کو منتشر اور متفرق رہنے کے بجائے منظم اور اجتماعی زندگی گذارنا چاہیے۔ تاکہ سفر میں آنے والی مشکلات کا مِل جُل کر مقابلہ کرسکیں اور اپنا تحفّظ کرسکیں، اور اللہ کے دین پر عمل کرنے کے تقاضے پورے کرسکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تنظیم و اجتماعیت

کے بغیر اللہ کے دین پر ٹھیک ٹھیک عمل کرنا ممکن نہیں ہے۔ منتشر ہونے کی حالت میں ہر انسان کو تنہا تنہا برائی اور فساد کی قوتوں سے لڑنا ہوگا جس میں اس کی ہار یقینی ہے۔ منتشر ہونے کی حالت میں مسلمانوں کے اندر بہت سے فتنے اٹھیں گے اور باہر سے بھی بہت سے فتنے ان پر حملہ آور ہوں گے اور منتشر مسلمان ان کا مقابلہ کر سکیں گے اور منتشر ہونے کی حالت میں مسلمان اپنے آپ کو خطرات سے بھی نہ بچا سکیں گے۔ نہ نیکی کے فروغ دینے اور برائی کے مٹانے کا فریضہ انجام دے سکیں گے۔ یہی نہیں منتشر اور منفرق ہونے کی صورت میں وہ خود بھی مغلوب ہوں گے اور ان کے ساتھ ان کا دین بھی۔ کفر، شرک، الحاد، فسق و فجور کی گرم بازاری ہوگی اور اُن کے لئے اپنے دین و ایمان کو بچانا بھی دشوار ہوگا۔

دین پر عمل کرنا ہو، دین کو پھیلانا ہو، نیکیوں کا حکم دینا ہو اور برائیوں کو مٹانا ہو، فتنوں کا استیصال کرنا ہو، اسلام اور امت مسلمہ کو خطرات سے بچانا ہو یا باطل کو مغلوب اور حق کو غالب کرنا ہو: ان سب کاموں کے لئے اہل حق کا حق کی بنیاد پر متحد اور منظم ہونا ضروری ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا۔ (پ۴ رکوع ۲) — اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور تفرقہ اور انتشار کی راہ اختیار نہ کرو۔

ایک اور جگہ فرمایا:

وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِیْحُكُمْ۔ (پ۱۰ رکوع ۲) — آپس میں جھگڑو مت ورنہ تم کمزور پڑ جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔

نظم و اجتماعیت کے لئے ضروری ہے کہ مسلمانوں کے کچھ سربراہ ہوں جو انہیں اللہ کے دین کے راستہ پر چلائیں اور مسلمان ان کی اطاعت و فرماں برداری کریں۔

قرآن مجید میں اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ (پ۵ رکوع ۵)	اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور تم میں سے جو سربراہ ہوں ان کی اطاعت کرو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی، جس نے نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی، اور جس نے اپنے سربراہ کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے امیر (سربراہ) کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔ اور امام (مسلمانوں کا سربراہ) تو ڈھال کی طرح ہوتا ہے کہ اس کی آڑ لے کر (اہل باطل سے) جنگ کی جاتی ہے اور اس کے ذریعہ (فتنوں اور خطرات سے) بچا جاتا ہے۔ ایک اور موقع پر آپ نے ارشاد فرمایا "اگر تمہارے اوپر کوئی ناک، کان کٹا غلام امیر بنا دیا جائے جو تمہاری رہنمائی اللہ کی کتاب کے تحت کرتا ہو تو اس کی بات سنو اور اس کی اطاعت کرو۔

ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میں تم کو پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں : (۱) اجتماعی زندگی۔ (۲) سمع۔ (۳) اطاعت۔ (۴) دین کے واسطے وطن چھوڑ دینا۔ (۵) خدا کی راہ میں جہاد کرنا۔ جو شخص جماعت سے ایک بالشت الگ ہوا اس نے اپنی گردن سے اسلام کے طوق کو نکال پھینکا۔ اور جو شخص جاہلیت (غیر اسلام اور مسلمانوں میں انتشار) کا نعرہ لگائے اور اس کی دعوت دے وہ جہنم کا کندہ ہے خواہ وہ روزہ رکھتا ہو، نماز پڑھتا ہو اور اپنے مسلمان ہونے کا مدعی ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو منظم اور اجتماعی زندگی گذارنا چاہیئے۔ ان کی ایک تنظیم اور ایک جماعت ہونی چاہیئے جس سے سارے

مسلمان وابستہ ہوں۔ اس تنظیم کا ایک سربراہ یا امیر ہونا چاہیئے۔ جس کے احکام کو سُننا اور اس کی اطاعت کرنا تمام مسلمانوں کا فرض منصبی ہونا چاہیئے۔ پھر اگر ضرورت پڑے تو دین کی خاطر وطن سے ہجرت اور دین کو غالب کرنے کے لئے جہاد ہونا چاہیئے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ امّت مسلمہ کی اس تنظیم سے باہر نکلنا گویا اسلام سے باہر نکلنا ہے۔ اور مسلمانوں میں ایسی باتیں پھیلانا جس سے ان کا رشتۂ اسلام کمزور ہو اور جس سے ان کی اسلامی تنظیم میں انتشار پیدا ہوتا ہو، کفر و جاہلیت کا کام ہے جس کی سزا جہنم کے سوا کچھ نہیں۔ آج مسلمان جن پریشانیوں اور مصیبتوں سے دوچار ہے اس کی ایک وجہ ان کا انتشار اور تفرقہ بھی ہے۔ اور یہ صورت حال اس وقت تک نہیں بدل سکتی جب تک مسلمان اسلام کی بنیادوں پر اسلامی اصولوں کے مطابق اسلام کے اِعلاء و سربلندی کے منظم نہ ہو جائیں۔

والدین کی اطاعت

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ بَرَّ وَالِدَيْهِ طُوْبٰى لَهٗ زَادَ اللّٰهُ فِيْ عُمُرِهٖ۔ (ابوداؤد)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو کوئی اپنے ماں باپ سے اچھا سلوک کرے اسے خوشخبری ہو۔ اللہ اس کی عمر زیادہ کرے۔

تشریح: یہ ایک دُعا اور بشارت ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت کے ہر اس بچّے کو دی ہے جو ماں باپ کا فرمانبردار اور خدمت گذار ہو۔ ارشاد ہوتا ہے کہ جو بچّہ سعادت مند ہوتا ہے وہ اپنے ماں باپ کا فرمانبردار ہوتا ہے، ان کا تابعدار رہتا ہے، ان کے ہر جائز حکم کو بجا لاتا ہے میں اسے جنّت کی بشارت دیتا ہوں اور اس کے لیئے دُعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس کی عمر میں برکت عطا فرمائے۔

اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے بعد اگر مسلمان پر کسی کی اطاعت مقدم ہے تو وہ ماں باپ ہی کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اور احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ماں باپ کی اطاعت اور ان کی خدمت، ان کی رضا جوئی اور ان کی خوشنودی کی بار بار تاکید کی ہے اور فرمایا کہ تم ہزار نیکیاں کرو مگر ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک سے پیش نہ آوٴ گے تو قیامت کے دن ایک نیکی بھی تمہارے کام نہ آئے گی۔ اسلام نے تمام اعمال میں جہاد کا درجہ سب سے بڑا اور سب سے اونچا قرار دیا ہے۔ اور جہاد کے متعلق یہاں تک فرمایا کہ اگر کوئی شخص اللہ کی راہ میں جنگ کرے اور شہید ہو جائے تو بلا حساب وکتاب جنت میں جائیگا اگرچہ وہ کتنا ہی گنہ گار کیوں نہ ہو۔ جب صحابہ کرام نے یہ سنا تو جہاد کی طرف لپکے۔ ایک صحابی ایسے تھے جن کے ماں باپ بوڑھے اور کمزور تھے اگر وہ جہاد پر چلے جاتے تو ان کی خدمت کے لئے گھر میں اور کوئی آدمی نہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم ہوا تو صحابی کو کہا " تم جہاد میں شریک نہیں ہو سکتے، گھر واپس جاوٴ اور اپنے ماں باپ کی خدمت کرو یہی تمہارا جہاد ہے "۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " ذلیل ہو وہ شخص، ذلیل ہو وہ شخص، ذلیل ہو وہ شخص، پوچھا گیا وہ کون ہے یا رسول اللہ، فرمایا " وہ جو اپنے والدین میں سے کسی کو بڑھاپے کی حالت میں پائے، اور ان کی خدمت کر کے جنت میں داخل نہ ہو "۔

ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا " رب کی خوشنودی باپ کی خوشنودی میں ہے اور رب کی ناراضی باپ کی ناراضی میں ہے "۔ ایک اور موقع پر آپ نے سب سے بڑے گناہوں کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا سب سے بڑے گناہ یہ ہیں " اللہ کے

کے ساتھ کسی کو شریک کیا جاتے، والدین کی نافرمانی یا حق تلفی کی جائے کسی شخص کو قتل کیا جائے اور جھوٹی قسم کھائی جائے۔"

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ اللہ کی رضا اور دنیا و آخرت کی کامیابی کیلئے والدین کی اطاعت ضروری ہے اور ان کی نافرمانی و حق تلفی دنیا و آخرت کی تباہی کی موجب ہے۔ واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے سلسلہ میں کسی کی اطاعت جائز نہیں ہے۔ خواہ وہ والدین ہی کیوں نہ ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:
"پیدا کرنے والے کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت روا نہیں۔"

اولاد کی تعلیم و تربیت

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ وُّلِدَ لَہٗ وَلَدٌ فَلْیُحْسِنْ اِسْمَہٗ وَاَدَّبَہٗ فَاِذَا بَلَغَ فَلْیُزَوِّجْہُ فَاِنْ بَلَغَ وَلَمْ یُزَوِّجْہُ فَاَصَابَ اِثْمًا فَاِنَّمَا اِثْمُہٗ عَلٰی اَبِیْہِ۔ (بیہقی)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کسی کے اولاد ہو اس کو چاہیئے کہ بچہ کا بہتر سے بہتر نام رکھے اور اس کی بہترین تعلیم و تربیت کا انتظام کرے اور جب وہ بالغ ہو جائے اسکی شادی کا انتظام کرے اگر اس نے جلد شادی نہیں کی اور وہ کوئی گناہ کر بیٹھا تو اس کی باز پرس اسکے باپ سے ہوگی

تشریح: اولاد کیا ہے؟ انسانی نسل کی بقاء اور مستقبل کی آبرو کا نام ہے اس دنیا میں یہی وہ قیمتی لعل ہے جس کی صحیح تربیت اور عمدہ پرورش مقصود ہے اور ہمیشہ سے انسانوں کی توجہ و کوشش کا اولین مصرف رہی ہے۔ کیونکہ دنیا کے مستقبل کی آبرو۔ اس کی اصلاح اور فساد کا دارومدار انہی پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاد کی صحیح تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دلائی اور ارشاد فرمایا کہ

اللہ جسے اولاد کی نعمت سے نوازے اس کو چاہیئے کہ اس کا بہترین نام رکھے کیونکہ نام کا اثر نام والے کی ذات پر بھی پڑتا ہے۔ اس لئے اسلام میں اس بات کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے کہ باپ اپنی اولاد کے لئے ایسے نام کا انتخاب کرے جس سے خدا اور بندہ، عابد اور معبود کی اعلیٰ سے اعلیٰ صفتوں کا اظہار ہوتا ہو اور مسمّٰی (نام والے) کی ذات پر اچھے اثرات پڑتے ہوں۔ اگر خدانخواستہ کسی نے ایسا نام چنا جس سے یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا، یا توحید کے مزاج کے خلاف ہو تو اسلام ایسے نام کو برداشت نہیں کرتا، ایسے غیر اسلامی نام کو فوراً بدل دینا چاہیئے۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں غیر اسلامی اور ناپسندیدہ ناموں کی تبدیلی کی بہت سی نظیریں پائی جاتی ہیں

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم برے نام بدل دیتے تھے۔ (ترمذی)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" قیامت کے دن خدا کے یہاں سب سے بُرا نام والا وہ شخص ہے جس کا نام شاہنشاہ ہو۔ (بخاری)۔ مسلم کی روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا" قیامت کے دن اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ ناپاک وہ شخص ہو جس کا نام بادشاہوں کا بادشاہ ہو۔ (کیونکہ) خدا کے سوا کوئی بادشاہ نہیں ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جُوَیرِیَّہ کا نام بَرّہ (نیک) تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نام بدل کر جُوَیرِیَّہ رکھ دیا۔ آپ کو یہ بُرا معلوم ہوتا تھا کہ آپ کو کوئی کہے کہ آپ برّہ کے پاس چلے گئے۔ (مسلم) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایک بیٹی تھی لوگ اسے عاصیہ کہتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا نام جمیلہ رکھ دیا۔ عبدالحمید بن جبیر بن شعیبہ فرماتے ہیں کہ میں سعید بن مسیب کے پاس بیٹھا تھا انھوں نے مجھ سے

بیان کیا کہ ان کے دادا " حَزن" نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ تمہارا نام کیا ہے؟ انھوں نے کہا میرا نام " حزن" ہے (یعنی سختی کے ہیں) آپ نے فرمایا (یہ نہیں) بلکہ تمہارا نام "سہل" (یعنی نرمی) ہے۔ انھوں نے عرض کیا کہ میرا نام جو میرے والد نے رکھ دیا ہے اب میں اُسے بدل نہیں سکتا (یہ سُن کر آپ خاموش رہے)۔ ابن مسیب فرماتے ہیں کہ پھر اس نام کی نحوست کی وجہ سے ہمیشہ ہمارے خاندان میں غمگینی اور سختی رہی۔ (بخاری)۔ حضرت زینب بنت ابی سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میرا نام " بَرَّہ" (نیک بخت) رکھا گیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنے نفسوں کی تعریف نہ کیا کرو۔ اللہ خوب جانتا ہے کہ نیکوکار کون ہے۔ اس کا نام زینب رکھ دو۔ (مسلم)۔ سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" تم اپنے بچے کا نام" یسار" اور نہ" رباح" نہ" نجیح" نہ" افلح" کیونکہ اگر تو پوچھے گا اس جگہ وہ ہے اور وہ نہ ہوگا جواب دینے والا کہے گا نہیں۔ (مسلم)

حضرت شریح بن ہانی اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ جب اپنی قوم کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سُنا کہ وہ لوگ انھیں "ابوالحکم" کے نام سے پکارتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں بلا کر پوچھا حکم کرنے والا تو خدا ہی ہے اور اسی کی طرف حکم (منسوب) ہے پھر تمہاری کنیت ابوالحکم کیوں ہے؟ انھوں نے کہا میری قوم کے لوگ جب کسی بات میں جھگڑتے ہیں تو میرے پاس آتے ہیں میں ان کا تصفیہ کرتا ہوں تو میرے حکم سے دونوں فریق راضی ہو جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ (فیصلہ کرنا) بہت اچھا ہے۔ اچھا تمہاری اولاد کے نام کیا کیا ہیں؟ وہ بولے میرے (بیٹے) شریح

اور مسلم اور عبداللہ ہیں۔ آپ نے فرمایا ان میں سے بڑا کون ہے؟ ہانی کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ سب سے بڑا شریح ہے۔ آپ نے فرمایا تو بس تم ابوشریح ہو۔ (ابوداؤد)۔ الغرض اسلام میں ایسے نام جو توحید کے منافی ہوں یا جن سے اعلیٰ سے اعلیٰ اوصاف کا اظہار نہ ہوتا ہو غلط اور غیر مسنون ہیں۔

اسلام میں نام کا معیار:۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن تمہیں تمہارے باپ کے نام سے پکارا جائے گا۔ لہذا تم اپنے اچھے نام رکھا کرو۔ حضرت ابو وہب جشمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے تم لوگ انبیاء کے نام پر اپنے نام رکھا کرو اور اللہ کے نزدیک سب ناموں میں اچھے نام عبداللہ، عبدالرحمٰن ہیں۔ اور سب سے سچے نام حارث اور ہمام ہیں۔ اور سب سے برے نام حرب اور مرہ ہیں (جن کے معنی لڑائی اور تلخی کے ہیں) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہارے ناموں میں سے اللہ تعالیٰ عبداللہ اور عبدالرحمٰن نام سب سے زیادہ پسند ہیں۔ علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ عبدالرحیم، عبدالصمد، عبدالملک اور اس جیسے دوسرے نام بھی یہی حکم رکھتے ہیں۔ سراجیہ میں ہے کہ علی، کبیر، رشید، بدیع، وغیرہ نام رکھنے جائز اور درست ہیں کیونکہ یہ الفاظ مشترک ہیں جب یہ انسانوں پر بولے جائیں تو اس سے مراد : معنی نہیں ہوتے جو اللہ پر بولنے کے وقت ہوتے ہیں۔ اصولاً جو بات اس میں سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے جو الفاظ بطور صفات بولے جاتے ہیں۔ ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ قسم ہے جو خصوصیت سے اس مرتبہ کے نہیں ہوتے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا کسی اور پر نہ بولے جا سکیں، اور دوسری قسم وہ ہے جو اللہ کی ذات کے ساتھ خاص ہیں پھر

اس خصوصیت میں بھی فرق ہے۔ وہ الفاظ جو اللہ تعالیٰ کے لئے بھی استعمال ہوتے ہیں اور دوسروں کے لئے بھی، جیسے حیّ، جمیل، حکیم، علی، سلام وغیرہ۔ ان کے استعمال میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس میں دیکھا جائے گا کہ استعمال کے قرینے یہ بتائیں گے یہاں مراد اللہ کی ذات ہے یا کوئی شخص۔ تہذیب التہذیب میں بھی اس کی ایک مثال موجود ہے "جمیل" اللہ تعالیٰ کا پیارا نام ہے اور لاکھوں مسلمان بھی یہ نام رکھتے ہیں۔ اور "علی" اللہ کا نام ہے اور کون نہیں جانتا کہ یہی نام حضرت علیؓ کا بھی ہے اور ہزاروں مسلمان اب بھی یہ نام رکھتے ہیں۔ "سلام" اللہ کا نام ہے لیکن "ابو سلام" نام رکھنا منع نہیں ہے۔ یہ الفاظ ایسے ہیں کہ جن کا استعمال اللہ کی ذات کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ یہ نام رکھنا اور کنیت رکھنا جائز ہے۔ اعلیٰ، یا علی بھی منجملہ انھیں الفاظ کے ہیں۔

بہترین نام رکھنے کی ہدایت دینے کے بعد ارشاد ہوا کہ ان کو بہتر سے بہتر تعلیم دو، کیونکہ بچے صاف اور سفید کاغذ کی طرح ہوتے ہیں۔ ان میں وہی نقش و نگار اُبھریں گے جو والدین ان میں اُبھارنے کی اور بھرنے کی کوشش کریں گے حکم ہے کہ ان کو علم و عمل کے پاکیزہ اصول اور آداب بتائے جائیں، ان کی پوری دیکھ بھال کی جائے، لغزش پر اُن کو سنبھالا جائے، بھول اور غلطی پر ان کی رہنمائی کی جائے اور غفلت و سستی پر اُنھیں حکیمانہ انداز میں متنبہ کیا جائے۔ یہی نہیں بلکہ حق تعالیٰ سے ان کے سعادت مند اور نیک ہونے کی دعائیں بھی کی جائیں۔

اولاد کی تعلیم و تربیت سے اچھے اخلاق و کردار کا بڑھانا مقصود ہے۔ جوانی میں اس مقصود کے متأثر ہونے کا ہر وقت خطرہ اور ہر ہر قدم پر اندیشہ ہوتا ہے۔ اس نازک مرحلہ میں بھی اسلام نے اخلاق کی حفاظت کے لئے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

اسلام زنا اور بے حیائی کے تمام کاموں کو حرام قرار دیتا ہے اور برائی کو انتہائی نفرت وحقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے وہ جنسی خواہش کی تسکین کے لیئے نکاح کا قاعدہ مقرر کرتا ہے اور اپنے اوپر ایمان لانے والوں کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اسی قانون کے تحت اپنے فطری تقاضوں کو پورا کریں۔ اس کی اہمیت ونزاکت کا اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ قانون کے تحت زندگی گذارنے والوں کو ایمان میں کامل قرار دیتا ہے اور جو لوگ اس قانون کے تحت زندگی گذارنے کے لائق تو ہیں لیکن ابھی اس پر عمل نہیں کرسکے ان کو ایمان میں ناقص بتاتا ہے۔ اولاد کے سرپرستوں کو ہدایت ہے کہ وہ اولاد میں جوں ہی نکاح کی اہلیت محسوس کریں جلد سے جلد ان کے لیئے ازدواج کا بندوبست کریں۔ اگر خدانخواستہ وہ اپنی سستی اور غفلت کی وجہ سے انتظام نہ کرسکیں اور لڑکا یا لڑکی کسی غلط کاری کا شکار ہوجائیں تو نہ صرف وہ مجرم قرار پائیں گے بلکہ ان کے سرپرستوں پر بھی فردِ جرم لگے گی اور ان کے ساتھ یہ بھی پکڑے جائیں گے۔

اُونچ نیچ

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَآ اَیُّھَا النَّاسُ ! اَلَآ اِنَّ رَبَّکُمْ وَاحِدٌ لَا فَضْلَ لِعَرَبِیٍّ عَلٰی عَجَمِیٍّ وَلَا لِعَجَمِیٍّ عَلٰی عَرَبِیٍّ وَلَا لِاَسْوَدَ عَلٰی اَحْمَرَ وَلَا لِاَحْمَرَ عَلٰی اَسْوَدَ اِلَّا بِالتَّقْوٰی۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔ اَلَا ھَلْ بَلَّغْتُ ؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگو! خبردار رہو تم سب کا خدا ایک ہے۔ کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر اور کسی کالے کو کسی گورے پر اور کسی گورے کو کسی کالے پر کوئی فضیلت نہیں، مگر تقوے کے اعتبار سے اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔ بتاؤ

قَالُوْا بَلٰى يَارَسُوْلَ اللّٰهِ۔ قَالَ فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ ۔ (بیہقی)۔	ہیں نے تمہیں بات پہونچادی؟ لوگوں نے عرض کیا ہاں یارسول اللہ۔ فرمایا اچھا تو جو موجود ہے وہ غیر موجود لوگوں تک بات پہونچا دے۔

تشریح: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجمع عام میں اعلان فرمایا کہ "کالے، گورے عربی، عجمی، ہندی، ترکی کے قومی امتیاز اور حسب نسب، ذات پات کے تفاخر کو مٹایا جاتا ہے اور آج سے شرافت و نجابت کا معیار تقویٰ، پرہیزگاری کو قرار دے کر سیادت کا باطل اور جاہلانہ عقیدہ محو کردیا گیا ہے۔ آدم علیہ السلام کی اولاد میں سوائے تقویٰ کے قومی نسبی فضیلت اور برتری کسی کو حاصل نہیں ہے۔ تمام انسانوں کا سلسلہ نسب ایک ہی ماں باپ سے جا ملتا ہے۔ اس لئے تقویٰ کے علاوہ کوئی چیز نہیں جو کسی کے لئے برتری اور فوقیت کا سبب ہو۔ قرآن مجید میں ہے:

يَآاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ط (پ۴ رکوع ۱۲)	اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم سب کو ایک شخص (حضرت آدم علیہ السلام) سے پیدا کیا۔ اور اس ایک شخص (آدم علیہ السلام کی جنس) سے اسکا جوڑا (حضرت حوا) کو پیدا کیا اور پھران دونوں کی نسل سے بہت سے مرد و عورتوں کو پیدا کیا۔

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا ۔ (پ۹ رکوع ۱۴)	اللہ تعالیٰ کی وہ ذات ہے جس نے تم سب کو ایک شخص سے پیدا کیا اور اس شخص کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ اس سے تسکین و آرام حاصل کرے۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ	اے انسانو! ہم نے تم سب کو ایک ہی مرد اور عورت
مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ	(آدم وحوا) سے پیدا کیا ہے۔ اور ہم نے تم کو
شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ	کنبوں اور قبیلوں کی شکل صرف اس لئے دی
إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ	ہے کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ یقیناً اللہ
أَتْقَاكُمْ ۔ (پ ۲۶ رکوع ۱۴)	کے نزدیک زیادہ بزرگ وہ ہے جو زیادہ متقی ہو

جب سب ایک ماں باپ سے پیدا ہیں تو سب نسب میں برابر ہیں پھر نسب میں فخر کرنا اور ایک دوسرے کو طعنہ دینا اور حقیر جاننا کہاں کی دانشمندی ہے۔

اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بجز تقویٰ و پرہیزگاری کے عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر اور گورے کو کالے پر اور کالے کو گورے پر کوئی فضیلت نہیں۔ تمام لوگ آدم علیہ السلام سے ہیں اور آدم علیہ السلام مٹی سے ہیں۔

ایک اور موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا جو لوگ اپنے مرے ہوئے باپ دادا پر فخر کرتے ہیں وہ اپنی اس حرکت سے باز آجائیں۔ ان کے باپ دادا تو جہنم کے ایندھن ہیں، ورنہ وہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں اس کیڑے سے زیادہ ذلیل ہوں گے جو غلاظت کو اپنی ناک سے ڈھکیلتا ہے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ نے تم سے جاہلیت کے فخر و غرور اور آباء واجداد کے ساتھ شیخی مارنے کو دور کر دیا ہے۔ اب یا تو کوئی شخص خدا ترس مومن ہے یا بد بخت نافرمان۔ سارے انسان آدم کی اولاد ہیں اور وہ مٹی سے بنے تھے۔

ایک موقع پر آپ نے فرمایا "تمہارے نسب اس لئے نہیں ہیں کہ تم ایک دوسرے کو برا بھلا کہو اور عار دلاؤ۔ تم سب کے سب آدم کی اولاد ہو اور سب کے

سب بالکل یکساں ہو۔ کسی شخص کو کسی شخص پر کوئی فضیلت نہیں بجز دین اور تقویٰ کے"۔ ان آیات واحادیث کی روشنی میں اچھی طرح واضح ہو گیا کہ تمام انسان باعتبار نسب کے برابر ہیں۔ کیونکہ سب ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں۔ لہٰذا باعتبار نسب کے کسی کو کسی پر کچھ بھی فوقیت اور شرف نہیں۔ اگر کسی کو کچھ شرافت وکرامت اور فوقیت و برتری حاصل ہے تو وہ تقویٰ اور عمل صالح کی وجہ سے ہے۔ اس لئے جو کوئی جس قدر تقویٰ اور عمل صالح میں زیادہ ہو گا اسی قدر وہ اسلام میں شریف اور معزز ہو گا۔ اور جو کوئی جس قدر تقویٰ اور عمل صالح میں پیچھے ہو گا اتنا ہی شرافت و بزرگی میں پیچھے ہو گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتَابِ وَالْمُشْرِکِیْنَ فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا ط اُولٰٓئِکَ ھُمْ شَرُّ الْبَرِیَّۃِ ط اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِکَ ھُمْ خَیْرُ الْبَرِیَّۃِ۔ (پ ۳۰ رکوع ۱۹)	اہل کتاب اور مشرکین میں سے جن لوگوں نے کفر کیا وہ جہنم کی آگ میں ہمیشہ رہیں گے اور یہی بدترین خلائق ہیں۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح کئے وہ اللہ کی مخلوق میں بہترین اور سب سے اچھے لوگ ہیں۔

جس طرح غیر مسلموں میں برہمن، چھتری اور ویش اعلیٰ ذات کے مانے جاتے ہیں اور باقی لوگ نیچ ذات کے اور ان میں آپس میں شادی بیاہ نہیں ہوتا اسی طرح جاہل اور نادان مسلمانوں کے نزدیک سید، مغل، پٹھان وغیرہ اعلیٰ ذات کے لوگ ہیں اور باقی مسلمان نیچی ذات کے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اخوتِ اسلامی کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور مسلمانوں کی مختلف برادریوں میں شادی بیاہ کو اسی طرح ناپسندیدہ اور غلط سمجھا جانے لگا جس طرح ہندوؤں میں، اور قومی و نسلی

تفاخر اور اونچ نیچ کا تصور پھر عود کر آیا۔ جسے اسلام نے پوری قوت سے ختم کیا تھا۔

عرب میں تو خرابی صرف یہیں تک تھی کہ لوگ نسب کے اعتبار سے اونچ نیچ کے قائل تھے۔ ہندوستان میں نسب کے ساتھ پیشوں سے بھی اونچ نیچ وابستہ ہے چنانچہ مسلمان بھی اونچ نیچ کے قائل ہو گئے ہیں اور یہ خیال کرنے لگے کہ فلاں پیشہ والے اونچے اور فلاں پیشہ کرنے والے نیچے ہیں۔ پھر پیشے میں بھی نسب چلنے لگا۔ اگر کسی شخص کے باپ دادا نے کوئی ایسا پیشہ اختیار کیا تھا جو سماج میں کمتر درجہ کا خیال کیا جاتا تھا تو وہ شخص بھی نیچی ذات کا سمجھا جاتا ہے خواہ اس نے وہ پیشہ ترک کر دیا ہو اور کوئی اونچا پیشہ اختیار کر لیا ہو۔ اسلام میں اس اونچ نیچ کی کوئی گنجائش نہیں۔ اسلام کی رُو سے تمام پیشے معزز ہیں۔ نہ کوئی جائز پیشہ کمتر درجہ کا ہے اور نہ کسی جائز پیشے کے اختیار کرنے والے نیچی ذات کے۔ انبیاء علیہم السلام نے جن سے بڑھ کر کوئی معزز نہیں ہو سکتا، مختلف پیشے اختیار کئے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کسی نے اس سے بہتر کھانا نہیں کھایا جو آدمی اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھاتا ہے اور اللہ کے نبی داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی کھاتے تھے"۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ہاتھ سے کوئی کام کرنا یا محنت مزدوری کرنا کوئی گری ہوئی بات نہیں ہے اور اکابر انبیاء علیہم السلام اپنے ہاتھ سے پیشہ کرتے رہے ہیں۔

قرآن مجید سے اندازہ ہوتا ہے کہ داؤد علیہ السلام لوہار تھے اور وہ ذرع اور لوہے کی مصنوعات بناتے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں قرآن مجید میں بار بار یہ بیان کیا گیا ہے کہ انھوں نے دس سال تک مزدوری پر بکریاں چرائیں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت سے پہلے بکریاں چرائی ہیں اور تجارت

کی ہے۔ اسی طرح صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں جن سے بڑھ کر کوئی معزز اور مشرف نہیں ہو سکتا، ہر نسب اور پیشہ کے لوگ تھے، ان میں ہاشمی بھی تھے اور غیر ہاشمی بھی، قریشی بھی تھے اور غیر قریشی بھی۔ عربی بھی تھے اور ایرانی اور رومی اور حبشی بھی، ان میں مزدور بھی تھے اور کاشتکار بھی، تاجر بھی، کپڑا بننے والے بھی اور لوہار بھی، غرض ہر پیشہ کے لوگ تھے مگر ان میں سے کسی کو نسب یا پیشے کی بنیاد پر نیچا نہیں خیال کیا جاتا تھا اور شادی بیاہ کا سلسلہ قائم تھا بلکہ غلاموں کو آزاد کر کے ان سے رشتۂ نکاح قائم کر لیا جاتا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب کا نکاح اپنے آزاد کردہ غلام حضرت زید کے ساتھ کر دیا۔ یہ اس بات کا اعلان ہے کہ دین میں تقویٰ کے سوا نسب و پیشہ وغیرہ کے لحاظ سے اونچ نیچ کی کوئی گنجائش نہیں اور مسلمانوں کی مختلف برادریوں میں بلا تامل شادی بیاہ ہونا چاہیئے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ حبشہ کے باشندے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ جب انھیں شادی کی ضرورت محسوس ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نکاح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی سے کیا۔

یہ دو مثالیں ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ اسلام میں نہ تو نسب کے لحاظ سے کوئی اونچ نیچ ہے اور نہ کسی اور پہلو سے۔ غلام سے زیادہ سماج میں کس کا مقام گرا ہوا ہوتا ہے لیکن جب کوئی غلام ایمان لے آئے اور وہ تقویٰ اور عمل صالح کی صفات اپنے اندر پیدا کر لے تو وہ ہمارا بھائی ہے۔ اگر وہ ان صفات میں بڑھ جائے تو ہمارا سردار ہے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی وفات پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا کہ ہمارے سردار اور ہمارے سردار (ابوبکر رضی اللہ عنہ) کے غلام کا انتقال ہو گیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی شہادت کے وقت فرمایا تھا کہ "اگر حذیفہ رضی اللہ عنہ

کے غلام حضرت سالم زندہ ہوتے تو میں انھیں اپنا جانشین بنا دیتا۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں نسب یا پیشہ کے اعتبار سے اونچ نیچ کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور اُمت کے وہ بہترین افراد جنھوں نے دین کی نمایاں خدمات انجام دی ہیں اور مسلمان جن کا انتہائی احترام کرتے ہیں ان کی عظیم اکثریت عربی نہیں بلکہ عجمی ہے اور ان میں سے بہت سے افراد غلام یا غلام زادے ہیں۔ اور ان میں بہت سے لوگ وہ پیشے کرتے تھے جنھیں آج مسلمانوں میں معیوب خیال کیا جاتا ہے۔

لباس

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
مَا اَسْفَلَ مِنَ الْكَعْبَيْنِ مِنَ الْاِزَارِ فَفِي النَّارِ ۔ (بخاری)	ازار کا جو حصہ ٹخنوں سے نیچے ہوگا وہ دوزخ میں جائے گا۔

تشریح : اسلام نے مسلمانوں پر کوئی خاص لباس اپنی طرف سے مقرر نہیں کیا۔ اسلام کی نگاہ میں لباس کی وہی حیثیت ہے جو اس کی فطری حیثیت، ہے یعنی یہ کہ اس سے :

(۱)۔ یہ مقصود پورا ہونا چاہیئے کہ انسان کے اندر جو فطری طور پر شرم وحیا کا مادہ رکھ دیا گیا ہے اس کی رُو سے وہ اپنے جسم کے جن حصّوں کو چھپانا چاہتا ہے لباس انھیں چھپا سکے۔

(۲)۔ موسم کے اثرات سے جسم کو محفوظ کر سکے۔ ان سادہ ضرورتوں کے لئے ظاہر ہے کہ ایک سادہ لباس کافی ہے لیکن اگر تہذیب اور تمدن کے ساتھ لباس کی کانٹ چھانٹ اور بناوٹ میں نئی نئی صورتیں پیدا کی جائیں تو وہ اسلام کی نظر میں وہ بُری نہیں بشرطیکہ لباس کے اختیار کرنے میں اللہ کی حدوں کا لحاظ رکھا جائے جنھیں

اسلام ضروری سمجھتا ہے۔ پہلی شرط یہ ہے کہ لباس میں سترؔ کے حدود کا لحاظ رکھا گیا ہو۔ تمام مرد خواہ وہ کسی ملک اور کسی قوم کے ہوں لازمی طور پر اپنے جسم کے ان حصّوں کو چھپائیں جو ناف اور گھٹنے کے درمیان ہیں۔ اور تمام عورتیں چاہے وہ کسی ملک میں رہتی ہوں ہاتھ پاؤں چہرہ کے سوا پورے جسم کو چھپائیں۔ اگر کسی ملک کا قومی لباس ستر کی ان حدوں کو پورا کر دے تو پھر اسلام یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ لباس کی تراش خراش، کانٹ چھانٹ کیسی ہو۔

دوسری شرط یہ ہے کہ مرد ریشم کا لباس اور سونے چاندی کے زیورات نہ پہنیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ مرد اور عورتیں ایسا لباس پہننے سے بچیں جس سے غرور، بے جا نمائش اور عیش پسندی کا اظہار ہوتا ہو۔ چنانچہ اسلام کی نظر میں یہ بات سخت ناپسندیدہ ہے کہ کوئی شخص ایسا لباس پہنے جسے تکبر کے ساتھ زمین پر گھسیٹ کر چلے یا جسے پہن کر ایک انسان دوسرے انسانوں کے مقابلے میں اپنی بڑائی جتائے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اس بات کو ناپسند کیا ہے کہ انسان کا تہبند یا پاجامہ ٹخنے سے نیچے ہو۔ چونکہ یہ تکبر کی نشانی ہے یا کم از کم متکبرین کے ساتھ مشابہت ہے اسی طرح یہ بات بھی صحیح نہیں ہے کہ ہم لباس میں ایسی وضع قطع اختیار کریں جس سے ہم میں اور غیر مسلموں میں فرق باقی نہ رہے اور ہمارا لباس ان کی طرح ہو جائے۔

کھانے پینے کے آداب

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
سَمِّ اللّٰهَ وَكُلْ بِيَمِيْنِكَ وَ	اللہ کا نام لو، داہنے ہاتھ سے کھاؤ اور
كُلْ مِمَّا يَلِيْكَ۔ (بخاری و مسلم)	اپنے قریب سے کھاؤ۔

تشریح : کھانے میں جس چیز کا لحاظ رکھنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ کھانے والا دیکھے کہ جو چیز وہ کھانے جا رہا ہے وہ حلال بھی ہے یا نہیں؟ اور وہ جائز طریقہ سے حاصل ہوئی ہے یا ناجائز طریقہ سے۔ پھر اتنا زیادہ نہ کھائے کہ بیمار پڑ جائے یا سستی پیدا ہو۔ جب تک بھوک نہ لگے کھانا نہ کھائے اور پیٹ بھرنے سے پہلے ہاتھ کھینچ لے۔ غذا سادہ ہو۔ کھانے سے پہلے ہاتھ دھولے، میلے کچیلے اور ہاتھ دھوئے بغیر کھانا صفائی اور ستھرائی کے خلاف ہے۔ بعض دفعہ ہاتھ ناپاک ہوتے ہیں یا ناخن میں گندگی لگی ہوتی ہے اور معلوم نہیں ہوتا، اس لئے کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھونے کی عادت رکھنی چاہیئے۔ کھانا کھانے کے لئے جب دستر خوان پر بیٹھے تو اپنی جوتیوں کو اتار دے اور اُکڑوں بیٹھے یا دونوں پیروں پر جس طرح تشہد کی حالت میں بیٹھتے ہیں۔ یا داہنے پیر پر اور بایاں پیر کھڑا رکھے، بلا عذر تکیہ لگا کر یا لیٹ کر یا کھڑے ہو کر کھانا پینا منع ہے۔ کھانا شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ آخر تک پڑھے یا صرف بسم اللہ پڑھے۔ اگر شروع میں بسم اللہ پڑھنی بھول گیا ہو تو جب یاد آجائے تو بِسْمِ اللّٰہِ اَوَّلَہٗ وَاٰخِرَہٗ پڑھ لے۔ یہ ہدایت اس لئے ہے کہ مومن کو یہ بات یاد آجائے کہ ہر نعمت اللہ کی طرف سے ہے اور یہ بھی یاد آجائے کہ وہ اللہ کا بندہ ہے۔ اور اسے کوئی ایسی چیز نہ کھانی چاہیئے جو حرام ہو۔ یا جس کے کھانے سے اللہ ناخوش ہوتا ہو۔ کھانا اپنے سامنے سے کھائے، بیچ میں سے یا ہر طرف سے نہ کھائے۔ ہاتھ سالن سے بھر جائے تو اسے روٹی سے نہیں پونچھنا چاہیئے چھوٹا چھوٹا لقمہ بنائے اور خوب چبا چبا کر کھائے۔ منہ کا لقمہ ختم ہونے سے پہلے دوسرا لقمہ نہ بنائے، کسی کھانے کی برائی نہ کرے، اگر پسند ہو تو کھائے ورنہ چھوڑ دے، زیادہ گرم کھانا نہ کھائے، گرم کھانے میں پھونکیں نہ مارے، ٹھنڈا ہونے کا

انتظار کرے۔ اگر کوئی لقمہ دستر خوان پر گر جائے تو اٹھا کر صاف کر کے کھالے۔ کھانے کے بعد انگلیوں کو خوب چاٹ کر صاف کرے، کھانے سے بھرے ہوئے ہاتھ کو دھونا مناسب نہیں ہے۔ اسی طرح کھانے کے برتن کو چاٹ کر صاف کر لینا چاہیئے اور غذا کو برباد نہ ہونے دینا چاہیئے۔ پھر یہ دُعا پڑھے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَطْعَمَنَا وَ سَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ (ترمذی)

شکر ہے اُس اللہ کا جس نے ہمیں کھلایا اور پلایا اور مسلمان بنایا۔

مجمع کے ساتھ کھانا ہو تو اپنے بڑے سے پہلے کھانا شروع نہ کرے۔ جب وہ کھانا شروع کر دے تو کھانا کھانا چاہیئے۔ کھانا کھاتے وقت بالکل چُپ چاپ نہ بیٹھے کچھ ایسی باتیں بھی کرتا جائے جس سے نشاط اور فرحت پیدا ہو، اپنے ساتھی کا خیال رکھے، اچھی اچھی چیزیں اس کے لئے چھوڑ دے، اس سے زیادہ نہ کھائے بلکہ خود کم کھائے اور اسے زیادہ کھلانے کی کوشش کرے، کوئی ایسی بات نہ کرے جو اس کی طبیعت کے خلاف ہو، کھاتے وقت کسی قسم کی بناوٹ نہ کرے بلکہ بے تکلفی کے ساتھ جتنا کھانا ہو کھالے۔ کھاتے وقت اپنے ساتھیوں کو نہ گھورے، نگاہ اپنے سامنے رکھے ساتھیوں سے پہلے اپنا ہاتھ نہ روکے، کھانے کے بیچ میں چھینک آجائے تو دوسری طرف منہ پھیر لے اور منہ پر ہاتھ رکھ لے۔ پانی پینے سے پہلے بِسْمِ اللّٰهِ کہے اور پانی پی لینے کے بعد اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کہے۔ پانی کا برتن سیدھے ہاتھ میں لے اور بیٹھ کر پیئے۔ بلا عذر لیٹ کر یا کھڑے ہو کر پانی پینا ٹھیک نہیں ہے۔ پانی پینے سے پہلے اچھی طرح دیکھ لے پھر پیئے۔ پانی کا برتن منہ کو لگا کر سانس نہ لے۔ ایک دم تمام پانی نہ پیئے بلکہ ٹھہر ٹھہر کر تین سانسوں میں پیئے۔

سلام

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلسَّلَامُ قَبْلَ الْکَلَامِ۔ (ترمذی) بات سے پہلے سلام کرو۔

تشریح: جب کسی سے ملو تو گفتگو سے پہلے السلام علیکم کہو۔ اس میں برکت بھی ہے اور محبت بھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم آپس میں ایک دوسرے سے ملو تو السلام علیکم (تم پر سلامتی ہو) کہا کرو اور دوسرا وعلیکم السلام و رحمۃ اللہ (تم پر بھی سلامتی اور اللہ کی رحمت ہو) کے الفاظ میں جواب دے تاکہ باہم اُنس پیدا ہو اور محبت بڑھے اور ایک دوسرے کو اپنے سے بڑھ کر خیر خواہ تصور کرے۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر واقف و ناواقف سے سلام کیا کرو۔ اور کبھی کسی سے ایسے ناراض نہ ہو کہ سلام تک چھوڑ دو۔ اگر تم سلام کو عام کرو گے تو اللہ تعالیٰ دلوں میں محبت ڈالے گا اور مالوں میں برکت دے گا اور شیطان تم میں اختلاف نہ پیدا کر سکے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ جب تم اپنے گھروں میں جاؤ تو گھر والوں کو السلام علیکم کہا کرو۔ سلام تمام گھر والوں کے لئے موجب برکت ہوگا۔ اس لئے ہر مسلمان مرد، عورت، بوڑھے بچے کا یہ فرض ہے کہ وہ جب کسی سے ملے تو پہلے السلام علیکم ضرور کہے۔ اور کوئی شخص سلام کے بغیر بات شروع کرے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ اس کی بات کا کوئی جواب نہ دو۔

السلام علیکم کہنے میں ثواب بھی ہے اور برکت بھی۔ اس کے علاوہ سلام کرنے کی عادت انسان کو غرور جیسی قبیح شئے سے نجات دلاتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "سلام کی ابتدا کرنے والا تکبر سے محفوظ رہتا ہے۔

ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کونسا اسلام (باعتبار عمل) بہتر ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا کھانا کھلانا (اور بلا امتیاز ہر ایک) آشنا و بیگانہ کو سلام کرنا"۔ ایک موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تک تم ایمان نہیں لاؤ گے جنت میں داخل نہیں ہو گے اور جس وقت تک آپس میں محبت نہیں ہو گی مومن نہیں ہو گے۔ کیا تمہیں ایسی چیز نہ بتاؤں جس سے آپس میں ایک دوسرے سے محبت پیدا ہو، سلام پھیلایا کرو"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو تین دن سے زیادہ چھوڑے کہ دونوں ملاقات کریں اور ایک دوسرے سے منھ پھیر لیں، انھیں چاہیئے کہ جب ملاقات ہو تو باہم سلام کریں اور دونوں میں بہتر وہ شخص ہے جو سلام کرنے میں پہل کرے"۔

ایک اور موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی مسلمان کو جائز نہیں کہ اپنے مسلمان بھائی سے تین روز سے زیادہ روٹھا رہے۔ اگر تین دن گذر جائیں تو اس مسلمان سے ملنا اور اسے سلام کرنا ضروری ہے۔ اگر اس نے سلام کا جواب دیدیا تو اجر و ثواب میں دونوں برابر کے شریک ہیں۔ اگر جواب نہ دیا تو گناہ کا وبال جواب نہ دینے والے پر رہے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سوار کے لئے ضروری ہے کہ پیدل چلنے والے کو سلام کرے اور پیدل چلنے والے کو چاہیئے کہ وہ بیٹھے ہوئے کو سلام کرے اور چھوٹی جماعت بڑی جماعت کو سلام کرنے میں پہل کرے۔

پیشاب و پاخانہ کے آداب

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِذَا اَتَیْتُمُ الْغَائِطَ فَلَا تَسْتَقْبِلُوا الْقِبْلَةَ وَلَا تَسْتَدْبِرُوْهَا۔ (بخاری)

جب تم پاخانہ اور پیشاب کے لیے آؤ تو قبلہ کی طرف منھ اور پیٹھ کر کے نہ بیٹھو۔

تشریح: کھلے میدان میں قبلہ کی طرف منھ یا پیٹھ کر کے پاخانہ یا پیشاب کے لئے بیٹھنا منع ہے۔ عام راستہ اور پانی کا گھاٹ، سایہ جس کے نیچے لوگ بیٹھتے اور آرام کرتے ہوں، پھل دار درخت کے نیچے، پانی کے جمع ہونے کی جگہ پر پیشاب، پاخانہ کے لئے بیٹھنے سے حضور نے منع فرمایا۔ آپ نے فرمایا لوگ اس کو برا بھلا کہیں گے۔ سوراخوں اور بلوں میں بھی پیشاب نہ کرے، بلوں میں اکثر کیڑے مکوڑے رہتے ہیں ان کو تکلیف ہوتی ہے اور پیشاب کرنے والے کو بھی ان کی وجہ سے تکلیف ہو جانے کا خطرہ ہے۔ پیشاب بیٹھ کر کرنا چاہیئے تاکہ پیشاب کی چھینٹوں سے کپڑے نجس نہ ہوں پیشاب کی چھینٹوں سے بچنے کی بہت تاکید آئی ہے۔ اکثر قبر کا عذاب اسی وجہ سے ہوتا ہے۔ پاخانہ کے بعد تین پتھروں یا ڈھیلوں سے بدن کو صاف کرنا یا پانی سے طہارت کرنا چاہیئے، اگر دونوں کو یکجا کر لیا جائے تو اور بھی اچھا ہے۔ پاخانہ اور پیشاب کے وقت پردہ کرنا ضروری ہے۔ اس وقت بولنا، باتیں کرنا، سلام کرنا یا جواب دینا منع ہے۔ پاخانہ یا پیشاب جاتے وقت یہ دعا پڑھے:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ۔

اے اللہ میں برے اور خبیث کاموں یا جنّوں سے بچنے کیلئے تیری پناہ چاہتا ہوں۔

اور جب فارغ ہو تو یہ دعا پڑھے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَذْهَبَ عَنِّی الْاَذٰی وَعَافَانِیْ۔

اللہ کا شکر ہے جس نے پاخانہ کی اذیت اور تکلیف سے نجات دی اور مجھے عافیت بخشی۔

ایک اور روایت میں یہ دُعا بھی ہے جو مختصر ہونے کے باوجود جامع ہے۔

غُفْرَانَكَ — اے اللہ میں تیری مغفرت چاہتا ہوں۔

یعنی جس طرح ظاہری گندگی سے تو نے پاک ہونے کی توفیق دی ہے اسی طرح برائیوں اور گناہوں سے پاک ہونے کی توفیق عطا فرما۔

پاخانہ۔ پیشاب کی جگہ کو داہنے ہاتھ سے چھونا منع ہے۔ کھلے میدان میں پاخانہ۔ پیشاب کا ارادہ ہو تو کھڑے کھڑے کپڑا اٹھا کر ننگا نہ ہونا چاہیئے۔ جب زمین کے قریب ہو جائے تب کپڑا اٹھائے۔

انسانوں سے حُسنِ سلوک

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا يَرْحَمُ اللّٰهُ مَنْ لَّا يَرْحَمُ النَّاسَ۔ (بخاری) — جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اس پر رحم نہیں کرتا۔

تشریح: لوگوں کو امداد باہمی پر توجہ دلائی گئی ہے اور ایک دوسرے پر ظلم و زیادتی سے منع کیا گیا ہے۔ یہ واضح رہے کہ اگر تم نے ایک دوسرے کے ساتھ اچھا سلوک نہ کیا اور پیار و نرمی کی جگہ سختی اور تند خوئی سے کام لیا تو اللہ تعالیٰ ناراض ہوگا اور اس شدت اور تند خوئی کے نتیجہ میں سخت سزا دیگا، پس تم اپنے خالق کی رضا جوئی حاصل کرو اور اس کے لطف و کرم کے خواہاں رہو اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ جب تم اللہ کے بندوں پر رحم کرو اور اپنی بساط بھر ان کے کام آؤ۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو لوگ انسانوں پر رحم کرتے ہیں خدائے مہربان ان پر رحم فرماتا ہے۔ اے انسانو! زمین والوں پر رحم

کرو، آسمان والا تم پر رحم فرمائے گا۔ ایک اور موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "رحمت سے وہی شخص محروم ہوتا ہے جو بدبخت ہوتا ہے"۔

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ مسلمان، مسلمان ہی کے لئے نہیں سب انسانوں کے لئے رحم وکرم کا پیکر ہوتا ہے۔ وہ اللہ کی تمام مخلوقات پر رحم کرتا ہے اور اس لئے کرتا ہے کہ اسی طرح وہ دنیا و آخرت میں اللہ کی رحمت کا مستحق ہو سکتا ہے۔

اپنے بھائی کیلئے وہی چاہو جو اپنے لئے چاہتے ہو۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يُحِبَّ	کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا
لِاَخِيْهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ ۔	جب تک کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کے
(بخاری)	لئے وہی پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہو

تشریح: کون مسلمان ایسا ہوگا جو یہ نہ چاہتا ہو کہ اس کا شمار اہل ایمان میں ہو۔ صاحب ایمان ہونے کے لئے جہاں اور بہت سی باتیں شرط ہیں وہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق ایمان کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ مومن جو کچھ اپنے لئے پسند کرتا ہے وہی وہ دوسروں کے لئے بھی پسند کرے۔

آپ کو اپنے لئے کیا کچھ پسند ہے اس کا اندازہ لگا لینا کچھ دشوار نہیں مثلاً آپ چاہتے ہیں کہ کوئی آپ کو گری ہوئی نظر سے نہ دیکھے آپ کو کسی طرح اپنی ذلت و توہین پسند نہیں ہے۔ لہذا آپ بھی دوسروں کو حقیر نہ سمجھیں اور کوئی ایسی

بات نہ کریں جس سے ان کی ذلت کا پہلو نکلتا ہو۔ آپ چاہتے ہیں کہ کوئی آپ سے بے رُخی اور بدمزاجی کے ساتھ بات نہ کرے، اس سے آپ کو تکلیف ہوتی ہے تو ذرا آپ بھی اس کا خیال رکھیں کہ دوسروں کے ساتھ بات کرتے ہوئے آپ کے کسی انداز سے بے رخی اور بدمزاجی کا اظہار نہ ہو۔

آپ چاہتے ہیں کہ کوئی آپ سے بدمعاملگی نہ کرے تو آپ بھی دوسروں کے ساتھ ویسا ہی کھرا معاملہ رکھیں جیسا آپ ان سے چاہتے ہیں۔

آپ چاہتے ہیں کہ کوئی آپ کو دُکھ نہ پہونچائے نہ زبان سے نہ ہاتھ سے۔ اس لئے لازم ہے کہ آپ بھی پوری طرح اس بات کا دھیان رکھیں کہ آپ کی زبان یا آپ کے ہاتھ سے کسی کو تکلیف نہ پہونچے۔

آپ کو یہ پسند نہیں کہ کوئی آپ کے کسی قسم کے نقصان کا موجب بن جائے۔ لہٰذا آپ بھی کوئی ایسا کام نہ کریں جس سے کسی دوسرے کو نقصان پہونچتا ہو۔

آپ چاہتے ہیں کہ جن لوگوں سے آپ کا واسطہ پڑے وہ اپنی حد تک آپ کی جان و مال کی نگرانی کریں، لہٰذا آپ بھی اس کا خیال رکھیں کہ جن لوگوں سے آپ کا واسطہ اور تعلق ہے وہ بھی آپ سے کچھ ایسی ہی امید رکھتے ہیں۔

آپ چاہتے ہیں کہ دوسرے آپ کے ساتھ ہمدردی کریں، آپ کے دکھ درد میں شریک ہوں، آپ بیمار ہو جائیں تو وہ آپ کی عیادت کریں، آپ ضرورت مند ہوں تو وہ آپ کا خیال رکھیں، بس یہی سب کچھ آپ بھی دوسروں کے ساتھ کریں۔

آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے پڑوسی اور ملنے جُلنے والے آپ کے بچّوں سے ساتھ محبت سے بات کریں، جہاں تک ہو سکے ان کی اصلاح پر نظر رکھیں اور غلط راہوں پر چلنے سے انھیں روکیں، بس یہی آپ کو دوسروں کے بچّوں کے ساتھ بھی کرنا ہے

مختصر یہ کہ جس طرح آپ اپنے لئے دُنیا و آخرت کی تمام کامیابیاں چاہتے ہیں بس اسی طرح آپ اپنے مسلمان بھائیوں کے لئے بھی دنیا و آخرت کی تمام کامیابیاں چاہیں ان کی دنیوی و اخروی کامیابی کے لئے فکرمند ہوں، انھیں ایسے مشورے دیں جن سے وہ دنیا میں کامیاب اور آخرت میں بامُراد ہوں۔ ان کی اصلاح وارتقاء کے لئے کوشاں اور اُن کی کامیابیوں پر جلنے کے بجائے دل سے خوش ہوں اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں۔

بھائی کی مدد

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اُنْصُرْ اَخَاكَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُوْمًا۔ — اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ ظالم ہو یا مظلوم ہو۔

(بخاری، ترمذی)

تشریح: اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ ظالم ہو یا مظلوم۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ اے اللہ کے رسول میں اپنے بھائی کی مدد مظلومیت کی حالت میں تو کروں گا مگر یہ واضح فرمائیے کہ ظالم ہونے کی حالت میں اس کی مدد کیسے کروں؟ آپ نے فرمایا تم اسے ظلم کرنے سے روک دو، کہ یہی دنیا و آخرت میں اس کی مدد ہے۔

مدد کئی طرح پر ہوتی ہے مالی، بدنی، اخلاقی، زبانی۔ ایک آدمی آپ کی سفارش چاہتا ہے آپ کی سفارش سے اس کا کام بن سکتا ہے تو سفارش کر دینا بھی مدد ہے۔ ایک آدمی آپ سے کوئی مشورہ طلب کرتا ہے۔ آپ کا ٹھیک اور صحیح رائے دینا بھی مدد ہے۔ ایک آدمی آپ سے وقت طلب کرتا ہے تو آپ کا وقت دینا بھی مدد ہے۔ اسی طرح اپنے مسلمان بھائی کو کسی گناہ اور برائی سے

بچانا اس کی بہت بڑی مدد ہے۔ الغرض مدد مالی ہو یا بدنی یا زبانی، ہر مسلمان کو ہر مسلمان کی کرنی لازمی ہے۔

سچّا مسلمان

قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَيَدِهٖ۔ (مسلم)۔	مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔

تشریح: اسلام کی رُو سے کسی مسلمان کا دل دکھانا، ایذا پہونچانا بہت بُرا ہے۔ تکلیف پہونچانے کے دو ہی ذرائع۔ ایک زبان، دوسرا ہاتھ۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کے بارے میں ہدایت فرمائی ہے اور کہا کہ اگر تمہاری زبان اور ہاتھ کی ایذاء سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں تو تم صحیح معنوں میں مسلمان ہو ورنہ تم مسلمان نہیں ہو۔ کیونکہ مسلمان وہی ہوتا ہے جو اپنی اور دوسروں کی سلامتی چاہے اور کسی کو کوئی تکلیف نہ دے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد میں ہاتھ سے پہلے زبان کا ذکر ہے۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ زبان سے دوسروں کو تکلیف پہونچانے کے مواقع زیادہ پیش آتے ہیں اور ہاتھ سے تکلیف پہونچانے کے کم۔ یہی نہیں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ زبان کی بے احتیاطی سے جھگڑے شروع ہوتے ہیں اور پھر ہاتھا پائی اور باقاعدہ جنگ کی نوبت آجاتی ہے۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ اگر سچے مسلمان بنیں اور کسی مسلمان کو ہم سے دکھ نہ پہونچے تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی زبان سے کسی کو تکلیف نہ پہونچائیں اور منھ سے وہی بات نکالیں جس سے اللہ راضی

اور بندے خوش ہوں۔ یہ سب اس لئے ہوتا ہے کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یاد نہیں رہتا۔ یاد رکھیئے کہ مسلمان وہی ہے جس کی زبان اور جس کے ہاتھ سے مسلمان کو دکھ نہ پہونچے۔

چھوٹوں پر رحم بڑوں کا ادب

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا	وہ شخص ہم سے نہیں جو ہمارے چھوٹوں پر
وَلَمْ يَعْرِفْ شَرَفَ كَبِيْرِنَا	رحم نہ کرے اور ہمارے بڑوں کے مقام
(ابوداؤد)	کو نہ پہچانے۔

تشریح: ہماری آپس کی خانہ جنگیاں، ایک دوسرے کی تحقیر و تذلیل، باہمی جور و ستم کی جو گرم بازاری ہے وہ محض اس لئے ہے کہ ہمارے دلوں سے بزرگوں کا ادب واحترام اٹھ گیا ہے۔ ہم ان کی باتوں کو خاطر میں نہیں لاتے اور جو دل میں آتا ہے کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم بڑی تیزی سے بگاڑ کی طرف دوڑے چلے جارہے ہیں۔ اس بگاڑ کی اصلاح اور درستگی اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک ہم اپنے بڑوں کا احترام اور ادب نہ کریں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارک تو یہ تھی کہ اپنے بڑوں کا ادب کرتے۔ آپ اگر کسی مجلس میں بیٹھے ہوتے تو انھیں اچھی جگہ مرحمت فرماتے۔ ایک دفعہ آپ کی رضاعی ماں جو ابھی مسلمان بھی نہ ہوئی تھیں آپ کے پاس آئیں تو آپ نے انھیں اپنی چادر مبارک پر بٹھایا

ایک مرتبہ یہودیوں کا ایک پیشوا آپ کے پاس آیا جو مذہباً آپکا مخالف تھا

اور شدید ترین عداوت رکھتا تھا آپ نے اسے اپنی جگہ پر لا کر بٹھایا، اور خود دوسری طرف بیٹھ گئے۔

بڑوں کی تعظیم و توقیر کے ساتھ چھوٹوں پر رحم کی تلقین فرمائی گئی کہ اگر ان سے کوئی غلطی اور فرو گذاشت ہو جائے تو عفو و درگذر سے کام لو، پیار و محبت سے ان کی اصلاح کی کوشش کرو۔ ان کے ساتھ شفقت اور پیار کا رویہ رکھو جب یہ بڑے ہوں گے تو یہ بھی چھوٹوں پر شفقت کریں گے، انھیں پیار بھری نظروں سے دیکھیں گے۔ دراصل اسلام تو نام ہی اس کا ہے کہ آدمی بڑے چھوٹے کے حقوق کا لحاظ رکھے۔ اگر کوئی ان حقوق کو ملحوظ نہیں رکھتا تو وہ درحقیقت مسلمان ہی نہیں ہے۔

مُسلمان مُسلمان کا بھائی ہے

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
اَلْمُسْلِمُ اَخُوْ الْمُسْلِمِ لَا یَظْلِمُہٗ	ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے نہ خود
وَلَا یُسْلِمُہٗ۔ (بخاری)	اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اسے کسی ظالم کے حوالہ کرتا ہے

تشریح: جس طرح ایک حقیقی بھائی کو دوسرے بھائی سے دلی ہمدردی ہوتی ہے اور وہ نہ خود اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ کسی دوسرے کو اس پر ظلم کرتے دیکھ سکتا ہے ٹھیک اسی طرح تمام مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں، نہ انھیں ایک دوسرے پر ظلم کرنا چاہیئے اور نہ کسی مسلمان کو مصیبت و پریشانی میں تنہا چھوڑنا چاہیئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا جو کوئی شخص اپنے بھائی مسلمان کی ضرورت پوری کرے گا اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت پوری کریگا اور جو کوئی کسی مسلمان بھائی کی (دُنیا کی) کسی پریشانی کو دُور کرے گا تو اللہ تعالیٰ

قیامت کی پریشانیوں میں سے کسی پریشانی کو اس سے دور فرمائے گا۔ اور جو کسی مسلمان بھائی کے عیب کی پردہ پوشی کرے گا، اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کے عیوب کی پردہ پوشی فرمائے گا۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو اس طرح بیان فرمایا کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے نہ خود اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اسے بے یار و مددگار چھوڑتا ہے اور نہ اس کے ساتھ حقارت سے پیش آتا ہے۔ آدمی کے لئے یہ بُرائی بہت بڑی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو ذلیل سمجھے۔ مسلمان مسلمان کے اوپر پورے کا پورا احترام ہے، اس کا خون، اس کا مال، اور اس کی آبرو۔

ایک اور موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے باہمی تعلقات پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا تم مسلمانوں کو ایک دوسرے پر رحم کھانے اور ایک دوسرے سے محبت و شفقت کرنے میں ایسا پاؤ گے جیسے کہ ایک بدن۔ کہ اگر اس کا کوئی عضو بیمار ہو جائے تو سارا بدن جاگ اور بخار میں مبتلا ہو کر اس کا ساتھ دیتا ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے باہمی رشتے کو واضح کرتے ہوئے فرمایا "مومن مومن کے لئے عمارت کے مانند ہے اس کا ایک حصہ دوسرے کے لئے مضبوطی کا باعث ہوتا ہے اور آپ نے اپنی انگلیوں کو آپس میں ڈال کر بتایا کہ ایسے"۔

مسلمان مسلمان کا آئینہ ہے

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلْمُسْلِمُ مِرْاٰةُ الْمُسْلِمِ۔ (بخاری) — ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا آئینہ ہے۔

تشریح : ایک مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اپنے بھائی کے اعمال وافعال پر نگاہ رکھے اور جہاں اسے سیدھی راہ سے ہٹتے دیکھے وہاں اس کو نصیحت کر کے سیدھا کرنے کی کوشش کرے۔ یہ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق ہے اگرچہ اس حق کی ادائیگی ایک ایسی چیز ہے جو اکثر ناگوار گذرتی ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اگر ایک فرد کے دل میں اس بات کا پورا احساس ہو کہ اصلی کامیابی آخرت کی کامیابی ہے اور تعلق کی اساس یہ ہے کہ دو بھائی ایک دوسرے کو اس کامیابی کے حاصل کرنے میں مدد دیں۔ کیونکہ دُنیا کا احتساب آخرت کے احتساب سے بہتر ہے تو وہ اپنے دل میں یقیناً اپنے بھائی کا شکر گذار ہوگا کہ اس نے دنیا ہی میں اس کی اصلاح کے لئے مواقع فراہم کر دیئے۔ اور پھر تنقید واحتساب کرنے والا ان تمام شرائط کو ملحوظ رکھے جو ضروری ہیں۔ اور اگر یہ کام دل سوزی، محبت اور خلوص سے ہو تو یہ شکر گذاری آگے بڑھ کر محبت میں اضافے اور تعلق میں زیادتی کا باعث ہوگی۔ اس لئے کہ تنقید کرنے والے کے بارے میں محسن کا تصور پیدا ہوگا۔

اس حدیث میں آئینہ کے ساتھ تشبیہ دے کر اس بات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ کسی کو سمجھانے اور نصیحت کرنے کا طریقہ وہی اختیار کرنا چاہیئے جو آئینہ کا ہے یعنی : (۱) بُرائیوں کا تجسس نہ ہونا چاہیئے۔ اس لئے کہ آئینہ کبھی تجسس نہیں کرتا۔ وہ آپ کے عیب کو اُس وقت ظاہر کرتا ہے جب آپ اسکے سامنے کھڑے ہو جائیں۔ (۲) پیٹھ پیچھے تنقید نہ ہو، اس لئے کہ آئینہ کسی کی شکل اس وقت تک ظاہر نہیں کرتا جب تک وہ اس کے روبرو نہ ہو۔

(۳) تنقید ضرورت سے زیادہ نہیں ہونا چاہیئے۔ اس لئے کہ آئینہ بلا کم وکاست اور بلا مبالغہ نقوش واضح کر دیتا ہے۔

(۴) تنقید بے لاگ ہونی چاہیئے اور بدنیتی اور غرض سے پاک وصاف، اس لئے کہ آئینہ جس کا نقش کرتا ہے اس سے کوئی کینہ نہیں رکھتا۔

(۵)۔ بات کہہ دینے کے بعد اسے پالنا نہیں چاہیئے، اس لئے کہ سامنے سے ہٹ جانے کے بعد آئینہ شکل کو محفوظ نہیں رکھتا یا بالفاظ دیگر پردہ دری نہیں ہونی چاہیئے"

شہادت

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہِ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا!

وَاعْلَمُوْا اَنَّ الْجَنَّۃَ تَحْتَ ظِلَالِ السُّیُوْفِ۔ (بخاری) — جان لو کہ جنت تلواروں کی چھاؤں میں ہے۔

تشریح: مومن کو اس دُنیا میں قدم قدم پر مخالف طاقتوں سے واسطہ پڑتا ہے، اس اعتبار سے مومن کی پوری زندگی کشمکش کی زندگی ہے۔ اس کو شیطان سے بھی لڑنا پڑتا ہے جو ہر آن اسے غلط راستے پر لے جانے کی گھات میں لگا ہوا ہے۔ وہ ہر وقت اسے سمجھاتا رہتا ہے کہ دیکھو نیکی اور خدا پرستی کی راہ پر چلوگے تو نقصان اٹھاؤ گے۔ اب مومن کا کام یہ کہ شیطان سے کشمکش کرتا ہے اور نقصان کی پرواہ کئے بغیر اس کے بتائے ہوئے راستہ سے ہٹ کر چلے اور بظاہر دکھائی دینے والے فائدوں پر لات مار کر اس منزل کی طرف قدم بڑھائے جس سے شیطان روکنا چاہتا ہے۔ اس طرح کی کوشش کو جہاد کہتے ہیں اور اسلام میں اس کا بڑا درجہ ہے۔

اس کا نفس تقاضا کرتا ہے کہ اس کی خواہشیں پوری کی جائیں اور خواہشوں کی کوئی حد نہیں، ایک خواہش پوری نہیں ہونے پاتی کہ دوسری پیدا ہوجاتی ہے

اب مومن کا کام یہ ہے کہ ہر وہ خواہش جو خدا کی مرضی اور اس کے حکم کے خلاف ہو اس کو زمین پر دے مارے اور نفس کے کہنے کو نہ مانے۔ اسی طرح پورا زور صرف کر دینا چاہیئے کہ مرد مومن خدا ترسی اور دینداری کو چھوڑ کر شیطنت اور بدی کے اس سیلاب میں غرق نہ ہو جائے جس میں وہ خود غرق ہے۔ اور اسی طرح اس کی کشمکش وقت کے غلط اقتدار سے بھی ہوتی ہے جو اپنی طاقت کے بل بوتے پر بدی، شیطنت، ظلم اور فساد کو فروغ دینے پر تلا ہوتا ہے۔ اور انفرادی زندگی کے چند معمولی سے گوشوں کو چھوڑ کر بقیہ زندگی میں اپنے ظالمانہ، مفسدانہ اور باطل قوانین جاری و نافذ کرتا ہے۔ کھلی بات ہے کہ ایسے نظام اقتدار کے تحت مرد مومن کے لئے حق پر چلنا سخت دشوار ہو جاتا ہے۔ اسے خدا کی پرستش کی تھوڑی سی آزادی تو ضرور حاصل ہوتی ہے اور بعض اوقات وہ بھی حاصل نہیں ہوتی لیکن باقی زندگی میں وہ اپنے آپ کو بدی اور شیطنت کے طوفان میں گھرا ہوا پاتا ہے۔ اس صورت حال میں مومن کے لئے یہ بات صحیح نہیں ہے کہ وہ بدی اور شیطنت کے آگے ہتھیار ڈالے اور خدا کا دامن چھوڑ کر شیطان کے راستہ پر چل پڑے۔ یہ روش مومن کی نہیں منافق اور کافر کی ہے۔ مومن ہر حال میں حق پر ثابت رہتا ہے۔ ناساز گار حالات سے کشمکش کرتا ہے اور اپنی صلاحیتوں، قوتوں، اپنے وقت اور جان و مال کو حق کے پھیلانے اور غالب کرنے میں اور باطل کو مٹانے یا مغلوب کرنے میں لگا دیتا ہے۔ اس راہ میں اس کے سامنے مصائب و مشکلات کے پہاڑ آتے ہیں مگر وہ ان سے خوف نہیں کھاتا۔ اسے جان و مال کی قربانی دینی پڑتی ہے اور وہ بے دریغ دیدیتا ہے۔

یہی وہ حقیقت ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں واضح کی

گئی ہے کہ "جنت تلواروں کی چھاؤں میں ہے" یعنی مومن کو باطل کی بڑی سے بڑی طاقت سے مرعوب ہونے کے بجائے اس سے کشمکش کا رویہ اختیار کرنا چاہیئے۔ اور تلواروں کو اپنے سر پر آتا دیکھ کر بدحواس ہونے کے بجائے یہ یقین کرنا چاہیئے کہ اس کے لئے جنت کا دروازہ کھل رہا ہے اور اگر اس نے راہ حق پر ثابت قدم رہتے ہوئے اللہ کی رضا کے لئے جان دیدی تو اس کا جنت میں جانا یقینی ہے۔ جنت، باطل کے آگے ہتھیار ڈال دینے سے نہیں بلکہ مردانہ وار اس سے کشمکش کرنے اور راہ حق میں جان و مال کی قربانی دینے سے حاصل ہوتی ہے۔

جو شخص حق کو قائم و غالب کرنے کے لئے باطل سے کشمکش کرتا ہوا اللہ کی خوشنودی کی خاطر اپنی جان قربان کردے، اسلام میں اس کو شہید کہتے ہیں اور اس قربانی کا نام شہادت ہے۔ شہادت کے لفظی معنی گواہی کے ہیں۔ اور جان کی اس قربانی کو شہادت اس لئے کہا جاتا ہے کہ شہید نے اپنی عزیز ترین متاع جان کو قربان کرکے اس بات کی شہادت دی کہ وہ اللہ کا بندہ اور اس کے دین کا سچا پیرو ہے۔ اور اللہ اور اس کے دین کے مقابلہ میں اسے کوئی چیز عزیز نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام میں شہید کا درجہ بہت اونچا ہے۔ تمام اہل ایمان دوبارہ اٹھائے جانے کے بعد جنت میں جائیں گے لیکن شہید کی روح وفات پاتے ہی جنت میں پہونچ جاتی ہے اور وہاں اسے ایک لطیف جسم مل جاتا ہے جس میں رہ کر وہ گھومتی پھرتی ہے اور اس کی نعمتوں سے مستفید ہوتی ہے۔ قرآن میں ہے:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۔ (پ۲ رکوع ۳)	جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے انھیں مُردہ مت کہو۔ وہ زندہ ہیں لیکن تم کو ان کی حیات کا شعور نہیں۔

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شہداء کی روحیں سبز پرندوں کی شکل میں جنت میں ہوتی ہیں اور ان کے قندیل عرش سے لٹکے ہوتے ہیں۔ وہ جنت میں جہاں چاہیں گھومتی پھرتی ہیں پھر انھیں قندیلوں میں بسیرا لیتی ہیں۔

ابو قتادہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز تقریر فرمانے کھڑے ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ جہاد فی سبیل اللہ اور ایمان باللہ اعمال میں سب سے بہتر ہے۔ اس پر ایک شخص کھڑا ہوا اور اُس نے پوچھا اے اللہ کے رسول آپ کا کیا خیال ہے اگر میں اللہ کی راہ میں مارا جاؤں تو کیا میرے سارے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بشرطیکہ تم اللہ کی راہ میں اس طرح شہید ہو کہ تم ثابت قدم رہے ہو، صرف اللہ کی رضا کے لئے جہاد کر رہے ہو مردانہ وار آگے بڑھتے رہو اور تم نے پیچھے ہٹنے کا نام نہ لیا ہو۔ بجز قرض کے کہ وہ معاف نہ ہو گا۔

شہادت کا اتنا بڑا اجر ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تمنّا کی ہے۔ آپ نے فرمایا اُس خدا کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے میں اس بات کی تمنا کرتا ہوں کہ میں اللہ کی راہ میں مارا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر مارا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر مارا جاؤں اور پھر زندہ کیا جاؤں اور پھر مارا جاؤں۔

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ شہادت کا غیر معمولی اجر اور شہید کا بہت بڑا مرتبہ ہے۔ لیکن شہادت ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتی۔ یہ اللہ کا کرم ہے کہ اس نے صدقِ دل سے شہادت کی تمنا کرنے والوں کو شہید کا درجہ عطا فرمانے کا فیصلہ فرمایا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس شخص نے سچے دل سے اللہ سے شہادت طلب

کی اللہ اسے شہید کا مرتبہ عطا فرمائے گا خواہ اس کی موت اپنے بستر پر ہی ہوئی ہو۔

مال کی حفاظت میں مرنا شہادت ہے

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
مَنْ قُتِلَ دُوْنَ مَالِہٖ فَھُوَ شَھِیْدٌ۔ جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: اس زمانہ میں حلال روزی کمانا بیحد مشکل اور دشوار ہے۔ قدم قدم پر رکاوٹیں اور دقتیں ہیں اور اسے حفاظت سے رکھنا اور عقلمندی سے خرچ کرنا تو اور مشکل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق "محشر میں جن پانچ باتوں کا سوال ہوگا، ان میں ایک سوال یہ بھی ہوگا کہ تم نے دولت کیسے کمائی اور کہاں خرچ کی؟ حلال ذریعہ سے حاصل کی تھی یا حرام طریقہ سے، اور اسے اُن جگہوں میں خرچ کیا جہاں اللہ کا حکم تھا یا جہاں دل چاہا وہاں خرچ کیا؟ ۔ الغرض حشر میں ہر شخص کو پائی پائی کا حساب دینا ہوگا۔ اس لئے ہر شخص پر لازم ہے کہ وہ اس بات کا خیال رکھے کہ جو کمائے جائز طور پر کمائے اور جو کچھ خرچ کرے وہ بھی جائز جگہوں میں خرچ کرے اور کچھ بچا کر رکھے تاکہ ضرورت کے وقت اس کے کام آئے۔ کسی کا محتاج نہ رہے اور نہ ذلیل ہو۔ اگر آپ اپنی کمائی سے کچھ بچا بچا کر نہیں رکھیں گے تو حج کیسے کریں گے، زکوٰۃ کیسے دیں گے، اس کے علاوہ نیکی کے اور کام ہیں وہ کیسے انجام پا سکتے ہیں؟ اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان کے لئے مال کا جمع کرنا بھی ضروری ہے اور اس کی حفاظت بھی لازمی ہے۔ اگر کوئی آپ کے مال پر ڈاکہ ڈالتا ہے اور آپ اس کے بچانے کے سلسلہ میں مارے جائیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کا ارشاد ہے کہ آپ کے اس طرح مرنے پر اجر دیا جائے گا۔ اور آپ کی یہ موت شہادت کی موت ہوگی کیونکہ آپ نے اسے حلال طور پر کمایا تھا اور حلال اور جائز طور پر آپ کو ملا تھا، اس کے کمانے پر ہر طرح کی محنت مشقت برداشت کی تھی جو ایک طرح کا جہاد ہے اور جہاد کی موت شہادت کی موت ہے۔

دُعا

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَۃِ۔ (ترمذی) دُعا عبادت کا مغز ہے۔

تشریح: دُعا، عاجزی تذلل اور مانگنے کو کہتے ہیں اور عبادت کا مفہوم بھی یہی ہے کہ اپنے سے بڑی اعلیٰ اور غالب ذات کے آگے انتہائی عاجزی اختیار کی جائے۔ اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ دُعا نہ صرف عبادت ہے بلکہ عبادت کی جان اور روح ہے۔ یہ واضح رہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت جائز نہیں اسی طرح کسی سے دُعا کرنا بھی جائز نہیں ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

وَقَالَ رَبُّکُمُ ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ ط اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَھَنَّمَ دَاخِرِیْنَ۔ (پ ۲۴ رکوع ۱۱)

تمہارا رب کہتا ہے "مجھے پکارو، میں تمہاری دُعائیں قبول کروں گا۔ جو لوگ گھمنڈ میں آکر میری عبادت سے منہ موڑتے ہیں، ضرور وہ ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔

اس آیت کی رُوح کو ٹھیک سمجھنے کے لئے تین باتیں اچھی طرح سمجھ لینی چاہئیں۔

اول یہ کہ دُعا آدمی صرف اُسی ہستی سے مانگتا ہے جس کو وہ سمیع و بصیر، اور

مافوق الفطرت اقتدار کا مالک سمجھتا ہے۔ اور دُعا مانگنے کا محرک دراصل آدمی کا یہ اندرونی احساس ہوتا ہے کہ عالم اسباب کے تحت فطری وسائل و ذرائع اس کی کسی تکلیف کو رفع کرنے یا کسی حاجت کو پورا کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں یا کافی ثابت نہیں ہو رہے ہیں اس لئے کسی مافوق الفطرت اقتدار کی مالک ہستی سے رجوع کرنا ناگزیر ہے۔ اس ہستی کو آدمی بے دیکھے پکارتا ہے۔ ہر وقت، ہر جگہ، ہر حال میں پکارتا ہے، تنہائیوں میں پکارتا ہے، باآواز بلند ہی نہیں، چپکے چپکے بھی پکارتا ہے بلکہ دل ہی دل میں اس سے مدد کی التجائیں کرتا ہے۔ یہ سب کچھ لازماً اس عقیدہ کی بنا پر ہوتا ہے کہ وہ ہستی اُس کو ہر جگہ ہر حال میں دیکھ رہی ہے، اس کے دل کی بات بھی سُن رہی ہے اور اُس کو ایسی قدرت مطلقہ حاصل ہے کہ اسے پکارنے والا جہاں بھی ہو وہ اس کی مدد کو پہونچ سکتی ہے اور اس کی بگڑی بنا سکتی ہے۔

دُعا کی اس حقیقت کو جان لینے کے بعد یہ سمجھنا آدمی کے لئے کچھ بھی مشکل نہیں رہتا کہ جو شخص اللہ کے سوا کسی اور ہستی کو مدد کے لئے پکارتا ہے وہ درحقیقت قطعی اور خالص اور صریح شرک کا ارتکاب کرتا ہے کیونکہ وہ اس ہستی کے اندر اُن صفات کا اعتقاد رکھتا ہے جو صرف اللہ تعالیٰ ہی کی صفات ہیں۔ اگر وہ اس کو اُن خدائی صفات میں اللہ کا شریک نہ سمجھتا تو اُس سے دُعا مانگنے کا تصور تک کبھی اُس کے ذہن میں نہ آسکتا تھا۔

دوسری بات جو اس سلسلہ میں اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے وہ یہ ہے کہ کسی ہستی کے متعلق آدمی کا اپنی جگہ یہ سمجھ بیٹھنا کہ وہ اختیارات کی مالک ہے اس سے یہ لازم نہیں آجاتا کہ وہ فی الواقع مالکِ اختیار ہو جائے۔ مالک اختیار ہونا تو ایک امر واقعی ہے جو کسی کے سمجھنے یا نہ سمجھنے پر موقوف نہیں ہے۔ جو درحقیقت اختیارات

کا مالک ہے وہ بہرحال مالک ہی رہے گا۔ خواہ آپ اسے مالک سمجھیں یا نہ سمجھیں اور جو حقیقت میں مالک نہیں ہے اس کو محض یہ بات کہ آپ نے اسے مالک سمجھ لیا ہے اختیارات میں ذرہ برابر بھی کوئی حصّہ نہ دلوا سکے گی۔ اب یہ بات ایک امر واقعی ہے کہ قادر مطلق اور مدبّر کائنات اور سمیع و بصیر ہستی صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہے اور وہی کُلّی طور پر اختیارات کا مالک ہے۔ دوسری کوئی بھی ہستی اس پوری کائنات میں ایسی نہیں ہے جو دُعائیں سُننے اور ان پر قبولیت یا عدم قبولیت کی صورت میں کارروائی کرنے کے اختیارات رکھتی ہو۔ اس امر واقعی کے خلاف اگر لوگ اپنی جگہ کچھ انبیاء اور اولیاء اور فرشتوں اور جنّات اور سیاروں اور فرضی دیوتاؤں کو اختیارات میں شریک سمجھ بیٹھیں تو اس سے حقیقت میں ذرہ برابر کوئی فرق رونما نہ ہو گا، مالک مالک ہی رہے گا اور بے اختیار بندے، بندے ہی رہیں گے۔

تیسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں سے دُعا مانگنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص درخواست لکھ کر ایوان حکومت کی طرف جائے مگر اصل حاکم ذی اختیار کو چھوڑ کر وہاں جو دوسرے سائلین اپنی حاجتیں لئے بیٹھے ہوں انہی میں سے کسی ایک کے آگے اپنی درخواست پیش کر دے اور پھر ہاتھ جوڑ جوڑ کر اس سے التجائیں کرتا چلا جائے کہ حضور ہی سب کچھ ہیں، آپ ہی کا یہاں حکم چلتا ہے میری مراد آپ ہی بَر لائیں گے تو بَر آئے گی۔ یہ حرکت اوّل تو بجائے خود سخت حماقت و جہالت ہے۔ لیکن ایسی حالت میں یہ انتہائی گستاخی بھی بن جاتی ہے جبکہ اصل حاکم ذی اختیار سامنے موجود ہو اور عین اس کی موجودگی میں اسے چھوڑ کر کسی دوسرے کے سامنے درخواستیں اور التجائیں پیش کی جا رہی ہوں۔ پھر یہ جہالت اپنے کمال پر اُس وقت پہونچ جاتی ہے جب وہ شخص جس کے سامنے درخواست

پیش کی جارہی ہو خود بار بار اس کو سمجھائے کہ میں تو خود تیری ہی طرح کا ایک سائل ہوں میرے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے اصل حاکم سامنے موجود ہے تو اس کی سرکار میں اپنی درخواست پیش کر مگر اس کے سمجھانے اور منع کرنے کے باوجود یہ احمق کہتا ہی چلا جائے کہ میرے سرکار تو آپ ہیں، میرا کام آپ ہی بنائیں گے تو بنے گا۔

ان تین باتوں کو ذہن میں رکھ کر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کو سمجھنے کی کوشش کیجئے کہ مجھے پکارو، تمہاری دعاؤں کا جواب دینے والا میں ہوں، انھیں قبول کرنا میرا کام ہے۔

اس آیت میں دو باتیں خاص طور قابل توجہ ہیں۔ ایک یہ کہ دعا اور عبادت کو یہاں مترادف الفاظ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ کیونکہ پہلے فقرے میں جس چیز کو دُعا کے لفظ سے تعبیر کیا گیا تھا اسی کو دوسرے فقرے میں عبادت کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ دُعا عین عبادت اور جان عبادت ہے۔ دوسرے یہ کہ اللہ سے دُعا نہ مانگنے والوں کے لئے "گھمنڈ میں آکر میری عبادت سے منہ موڑتے ہیں" کے الفاظ استعمال کئے گئے، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگنا عین تقاضائے بندگی ہے اور اس سے مُنہ موڑتے کے یہ معنی ہیں کہ آدمی تکبر میں مبتلا ہے۔ اس لئے اپنے خالق و مالک کے آگے اعتراف عبودیت کرنے سے کتراتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات میں آیت کے ان دونوں مضامین کو کھول کر بیان فرما دیا ہے۔ حضرت نعمان بن بشیر کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِنَّ الدُّعَاءَ هُوَ الْعِبَادَةُ ثُمَّ قَرَأَ اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ — دُعا عین عبادت ہے، پھر آپ نے یہ آیت پڑھی۔ (احمد، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، ابی حاتم، ابن جریر)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

مَنْ لَّمْ یَسْأَلِ اللّٰہَ یَغْضَبْ عَلَیْہِ جو اللہ تعالیٰ سے نہیں مانگتا اللہ اس پر غضبناک ہوتا ہے۔ (ترمذی)

اس مقام پر پہونچ کر یہ عقدہ بھی حل ہوجاتا ہے جو بہت سے ذہنوں میں اکثر الجھن ڈالتا رہتا ہے۔ لوگ دُعا کے معاملہ پر اس طرح سوچتے ہیں کہ جب تقدیر کی بُرائی اور بھلائی اللہ کے اختیار میں ہے اور وہ اپنی غالب حکمت ومصلحت کے لحاظ سے جو فیصلہ کر چکا ہے وہی کچھ لازماً رونما ہوکر رہتا ہے تو پھر ہمارے دُعا مانگنے کا حاصل کیا ہے۔ یہ ایک بڑی غلط فہمی ہے جو آدمی کے دل سے دُعا کی ساری اہمیت نکال دیتی ہے۔ اور اس باطل خیال میں مبتلا رہتے ہوئے اگر آدمی دُعا مانگے بھی تو اس کی دُعاؤں میں کوئی رُوح باقی نہیں رہتی۔ قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیت اس غلط فہمی کو دو طریقوں سے رفع کرتی ہے :

اوّلاً اللہ تعالیٰ بالفاظ صریح فرما رہا ہے کہ "مجھے پکارو، میں تمہاری دُعائیں قبول کروں گا۔" اس سے صاف معلوم ہوا کہ قضا اور تقدیر کوئی ایسی چیز نہیں جس نے ہماری طرح معاذ اللہ خود اللہ تعالیٰ کے ہاتھ بھی باندھ دیئے ہوں اور دُعا قبول کرنے والے کے اختیارات اُس سے سلب ہوگئے ہوں۔ بندے تو بلاشبہ اللہ کے فیصلوں کو ٹال لینے یا بدل دینے کی طاقت نہیں رکھتے، مگر اللہ تعالیٰ خود یہ طاقت ضرور رکھتا ہے کہ کسی بندے کی دُعائیں اور التجائیں سُن کر اپنا فیصلہ بدل دے۔

دوسری بات جو اس آیت میں بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ دُعا خواہ قبول ہو یا نہ ہو بہرحال ایک فائدے اور بہت بڑے فائدے سے وہ کسی صورت میں بھی خالی نہیں ہوتی، اور وہ یہ کہ بندہ اپنے رب کے سامنے اپنی حاجتیں پیش

کر کے اور اس سے دُعا مانگ کر اُس کی آقائی و بالادستی کا اعتراف اور اپنی بندگی و عاجزی کا اعتراف واقرار کرتا ہے۔ یہ اظہار عبودیت بجائے خود عبادت بلکہ جانِ عبادت ہے جس کے اجر سے بندہ کسی حال میں بھی محروم نہیں رہے گا، قطع نظر اس کے کہ وہ خاص چیز اس کو عطا کی جائے یا نہ کی جائے جس کے لیئے اس نے دُعا کی تھی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں ان دونوں مضامین کی بھی پوری وضاحت ہمیں مل جاتی ہے۔ پہلے مضمون پر حسب ذیل احادیث روشنی ڈالتی ہیں:

حضرت سلمان کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا یَرُدُّ الْقَضَاءَ اِلَّا الدُّعَاءُ۔ (ترمذی) قضا کو کوئی چیز نہیں ٹال سکتی مگر دُعا۔

یعنی اللہ کے فیصلے کو بدل دینے کی طاقت کسی میں نہیں ہے مگر اللہ خود اپنا فیصلہ بدل سکتا ہے اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب بندہ اس سے دُعا مانگتا ہے۔

حضرت جابر بن عبداللہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَا مِنْ اَحَدٍ یَدْعُوْ بِدُعَاءٍ اِلَّا اٰتَاہُ اللّٰہُ مَا سَأَلَ اَوْکَفَّ عَنْہُ مِنَ السُّوْءِ مِثْلَہٗ مَا لَمْ یَدْعُ بِاِثْمٍ اَوْ قَطِیْعَۃِ رَحْمٍ۔ (ترمذی)

آدمی جب کبھی اللہ سے دعا مانگتا ہے اللہ اسے یا تو وہ چیز دیتا ہے جس کی اس نے دعا کی تھی یا اسی درجہ کی کوئی بلا اس پر آنے سے روک دیتا ہے، بشرطیکہ وہ کسی گناہ کی یا قطع رحمی کی دُعا نہ کرے۔

اسی سے ملتا جُلتا مضمون ایک دوسری حدیث میں ہے جو حضرت ابوسعید خُدری رضؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے۔ آپ کا ارشاد یہ ہے کہ:

مَا مِنْ مُسْلِمٍ یَدْعُوْ بِدَعْوَۃٍ لَیْسَ فِیْھَا اِثْمٌ وَلَا قَطِیْعَۃُ رَحْمٍ

ایک مسلمان جب کبھی کوئی دُعا مانگتا ہے بشرطیکہ وہ کسی گناہ یا قطع رحمی کی دُعا نہ ہو تو

إِلَّا أَعْطَاهُ اللّٰهُ إِحْدَى ثَلٰثٍ، إِمَّا أَنْ يُعَجِّلَ لَهُ دَعْوَتُهُ، وَإِمَّا أَنْ يَدَّخِرَهَا لَهُ فِي الْاٰخِرَةِ وَإِمَّا أَنْ يَصْرِفَ عَنْهُ مِنَ السُّوْءِ مِثْلَهَا۔ (مسند احمد)

اللہ تعالیٰ اسے تین صورتوں میں سے کسی ایک صورت میں قبول فرماتا ہے۔ یا تو اس کی وہ دُعا اسی دنیا میں قبول کرلی جاتی ہے یا اسے آخرت میں اجر دینے کیلئے محفوظ رکھ لیا جاتا ہے یا اسی درجہ کی کسی آفت کو اس پر آنے سے روکدیا جاتا ہے

حضرت ابوہریرۃؓ کا بیان ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إِذَا دَعَا أَحَدُكُمْ فَلَا يَقُلْ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ إِنْ شِئْتَ، اِرْحَمْنِيْ إِنْ شِئْتَ، اُرْزُقْنِيْ إِنْ شِئْتَ، وَلْيَعْزِمْ مَسْئَلَتَهُ۔ (بخاری)

جب تم میں سے کوئی شخص دُعا مانگے تو یوں نہ کہے کہ خدایا مجھے بخش دے اگر تو چاہے، مجھ پر رحم کر اگر تو چاہے، مجھے رزق دے اگر تو چاہے۔ بلکہ اسے قطعیت کے ساتھ کہنا چاہیئے کہ خدایا میری فلاں حاجت پوری کر۔"

دوسری روایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے ان الفاظ میں آئی ہے کہ آپ نے فرمایا:

اُدْعُوا اللّٰهَ وَاَنْتُمْ مُوْقِنُوْنَ بِالْاِجَابَةِ۔ (ترمذی)

اللہ سے دُعا مانگو اس یقین کے ساتھ کہ وہ قبول فرمائے گا۔"

ایک اور روایت میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ:

يُسْتَجَابُ لِلْعَبْدِ مَا لَمْ يَدْعُ بِاِثْمٍ اَوْ قَطِيْعَةِ رَحِمٍ مَا لَمْ يَسْتَعْجِلْ۔ قِيْلَ يَا رَسُوْلَ

بندہ کی دُعا قبول کی جاتی ہے بشرطیکہ وہ کسی گناہ کی یا قطع رحمی کی دُعا نہ کرے اور جلد بازی سے کام نہ لے۔ عرض کیا گیا کہ جلد بازی کیا ہے

اللّٰهِ مَا الْاِسْتِعْجَالُ؟ قَالَ يَقُوْلُ قَدْ دَعَوْتُ وَقَدْ دَعَوْتُ فَلَمْ يُسْتَجَابُ لِيْ فَيَسْتَحْسِرُ عِنْدَ ذَالِكَ وَيَدَعُ الدُّعَاءَ۔ (مسلم)

یا رسول اللہ؟ فرمایا، جلدبازی یہ ہے کہ آدمی کہے میں نے بہت دُعا کی، بہت دُعا کی مگر میں دیکھتا ہوں کہ میری دُعا قبول ہی نہیں ہوتی۔ اور یہ کہہ کر آدمی مایوس ہو جائے اور دُعا مانگنی چھوڑ دے۔"

دوسرے مضمون کو حسب ذیل احادیث واضح کرتی ہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَيْسَ شَئٌ اَكْرَمَ عَلَى اللّٰهِ مِنَ الدُّعَاءِ۔ (ترمذی۔ ابن ماجہ)

"اللہ کی نگاہ میں دُعا سے بڑھ کر کوئی چیز باوقعت نہیں ہے۔"

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا:

سَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ اَنْ يُّسْئَلَ۔ (ترمذی)

"اللہ تعالیٰ سے اس کا فضل مانگو کیونکہ اللہ اسے پسند فرماتا ہے کہ اس سے مانگا جائے۔"

حضرت ابن عمر اور حضرت معاذ بن جبل کا بیان ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِنَّ الدُّعَاءَ يَنْفَعُ مِمَّا نَزَلَ وَمِمَّا لَمْ يَنْزِلْ۔ فَعَلَيْكُمْ عِبَادَ اللّٰهِ بِالدُّعَاءِ۔ (ترمذی)

"دُعا بہرحال نافع ہے اُن بلاؤں کے معاملے میں بھی جو نازل ہو چکی ہیں اور ان کے معاملہ میں بھی جو نازل نہیں ہوئیں۔ پس اے بندگانِ خدا تم ضرور دُعا مانگا کرو۔"

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

يَسْئَلُ اَحَدُكُمْ رَبَّهٗ حَاجَتَهٗ

تم میں سے ہر شخص کو اپنی ہر حاجت خدا

كُلَّهٗ حَتّٰى يَسْئَلَ شِسْعَ نَعْلِهٖ إِذَا انْقَطَعَ ۔ سے مانگنی چاہیئے ۔حتیٰ کہ اگر اس کی جوتی کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو خدا سے دعا کرے"۔ (ترمذی)

یعنی جو معاملات بظاہر آدمی کو اپنے اختیار میں محسوس ہوتے ہیں ان میں بھی تدبیر کرنے سے پہلے اسے خدا سے مدد مانگنی چاہیئے ۔اس لئے کہ کسی معاملہ میں بھی ہماری کوئی تدبیر خدا کی توفیق وتائید کے بغیر کامیاب نہیں ہوسکتی اور تدبیر سے پہلے دُعا کے معنی یہ ہیں کہ بندہ ہر وقت اپنی عاجزی اور خدا کی بالادستی کا اعتراف کر رہا ہے (تفہیم القرآن)

دعا کی قبولیت کے اوقات :۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ کس وقت دُعا زیادہ قبول ہوتی ہے ؟ آپ نے فرمایا آخری رات کے بیچ میں اور ہر فرض نماز کے بعد۔ اسی طرح آپ نے فرمایا کہ جو دُعا اذان اور اقامت کے درمیان مانگی جاتی ہے وہ رد نہیں کی جاتی ۔ آپ نے فرمایا کہ جمعہ کے دن ایک ایسا وقت ہوتا ہے کہ اگر کوئی اُس وقت کو پالے اور دعا کرے تو دعا قبول ہوتی ہے ۔آپ نے فرمایا کہ دو وقت ایسے ہیں کہ اس میں دُعا رد نہیں ہوتی ۔ایک وقت تو وہ ہے جب کہ اذان دی جا رہی ہو۔ دوسرا جب کہ گھمسان کی لڑائی ہو رہی ہو۔ ایک روایت میں ہے کہ جب بارش ہو رہی ہو۔ آپ نے فرمایا کہ ماں ، مسافر، اور مظلوم کی دُعا رد نہیں ہوتی۔

دُعا کے آداب :۔ دُعا کے وقت دونوں ہاتھ اس طرح اٹھائیں کہ ہتھیلیاں سامنے ہوں اور ہاتھ اتنا اونچا ہو کہ دونوں ہاتھ کی انگلیاں کاندھے کے مقابل ہوں۔

دُعا کے قبول نہ ہونے کے اسباب :۔ قبولیت دُعا کے لئے آپ نے ارشاد فرمایا کہ اکل حلال (حلال روزی) ، صدق مقال (سچ بولنا) کی ضرورت ہے۔

جس طرح پرندہ اپنے دو پروں پر اُڑتا ہے اسی طرح دُعا ان دو پر اکل حلال، اور صدق مقال پر اُڑ کر دربار الٰہی تک پہونچتی ہے اور قبولیت کا درجہ حاصل کرتی ہے۔

ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "انسان دُعا کرتا ہے اور نہایت عاجزی سے کرتا ہے پھر اُکتا کر کہنے لگتا ہے کہ خدا نے میری دُعا نہیں سُنی حالانکہ اس کا کھانا حرام کا ہوتا ہے اُس کا لباس حرام کا ہوتا ہے اور وہ حق سے دور بھاگتا ہے، پھر خُدا اُس کی فریاد کیوں سُنے۔ جو دُعا مذکورہ شرطوں کے ساتھ کی جائے گی وہ ضرور قبول کی جائے گی خواہ ہمیں معلوم ہو سکے یا نہ ہو سکے۔ مثلاً ایک شخص دُعا کرتا ہے کہ الٰہی مجھے بیٹا دے، کئی سال وہ یہی دُعا کرتا رہا مگر بیٹا نہ ملا۔ وہ سمجھتا ہے کہ دُعا قبول نہیں ہوئی"۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن ایک شخص کے اعمال تولے جائیں گے تو اس کے گناہ بڑھ جائیں گے اور نیکیاں کم ہوں گی۔ وہ سمجھے گا کہ اب میں جہنم میں گیا۔ اتنے میں اس کی ایک نیکی نیک اعمال والے پلڑے میں ڈال دی جائے گی جو تمام گناہوں پر غالب آجائے گی اور وہ اس نیکی کی وجہ سے جنتی ہو جائے گا۔ وہ پوچھے گا میرے مولا! میری کون سی نیکی ہے جو اتنی وزنی ہے ارشاد ہوگا یہ تیری دعا ہے جو تو نے کی تھی کہ الٰہی مجھے بیٹا دے، دعا تو میں نے قبول کر لی مگر بیٹا نہ دیا۔ اس لئے کہ میرے علم میں بیٹا تیرے لئے مفید نہ تھا۔ تو یہ سمجھا کہ دُعا قبول نہیں ہوئی، حالانکہ وہی دُعا آج تیرے لئے نجات کا ذریعہ بن رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے اس لئے وہی جانتا ہے کہ کون سی دُعا قبول کر لی جائے تو اس کے لئے مفید ہوگی اور کون سی دعا (دُنیاوی اعتبار سے) قبول نہ کی جائے تو قیامت کے دن کام آئے گی۔

دُعا کی قبولیت کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ دُعا کرنے والا اللہ تعالیٰ سے عاجزی کے ساتھ مانگے اور اپنی احتیاج اور بے بسی کو پوری طرح محسوس کر کے اللہ تعالیٰ سے دعا کرے۔ انسان جس قدر عاجزی اور خشوع وخضوع کا رویّہ اختیار کرے گا، اتنی ہی اس کی دُعا قبول ہوگی۔ قرآن مجید میں ہے:

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ؕ (پ رکوع) اپنے رب سے دعا مانگو گڑگڑا کر اور چھپ چھپ کر۔

دُعا کی قبولیت کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ انسان کو اس کی قبولیت کا یقین ہو اور وہ یہ سمجھتا ہو کہ اللہ تعالیٰ دُعائیں قبول کرتا ہے۔ اور اگر یہ دُعا میرے حق میں مفید ہوگی تو ضرور قبول فرمائے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ سے اس حال میں دُعا مانگو کہ تمہیں دُعا کی قبولیت کا یقین ہو، اور اس بات کو خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ کسی ایسی دُعا کو قبول نہیں فرماتا جو غافل دل سے کی گئی ہو۔

دُعا کے آداب میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ اسے اللہ کی مشیت کے ساتھ اس کو مشروط نہ کیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے جب کوئی دُعا کرے تو یہ نہ کہے کہ اے اللہ تو میری مغفرت فرما دے اگر تو چاہے مجھے رزق عطا کر اگر تو چاہے، اس کے بجائے اس کو بغیر کسی شرط کے اللہ سے سوال کرنا چاہیئے۔ کیونکہ وہ جو چاہتا ہے وہی کرتا ہے اور اسے مجبور کرنیوالا نہیں۔

ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی شخص دُعا کرے تو یہ نہ کہے کہ اے اللہ تُو میری مغفرت فرما دے اگر تو چاہے، اس کے برعکس بغیر کسی شرط کے مانگے، اور اللہ تعالیٰ سے زیادہ سے زیادہ امید رکھے، کیونکہ کسی بھی چیز کا عطا کرنا اس کے لئے مشکل نہیں۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جو

دعائیں اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول ہوتی ہیں ان میں سب سے زیادہ مؤثر وہ دُعا ہے جو کوئی مسلمان اپنے مسلمان بھائی کے لئے بیٹھ پیچھے مانگے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مسلمان کی دُعا اپنے مسلمان بھائی کے لئے اس کے پیٹھ پیچھے ضرور قبول ہوتی ہے۔ اس کے سر کے پاس ایک فرشتہ متعین ہوتا ہے جب کبھی وہ اپنے مسلمان بھائی کے لئے کسی بھلی چیز کے لئے دُعا کرتا ہے تو وہ متعین فرشتہ آمین کہتا ہے اور یہ بھی کہتا ہے کہ اے دعا کرنے والے تجھے بھی ایسی نعمت ملے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح دعا کی فضیلت بیان کی ہے اور دعا کرنے کی زیادہ سے زیادہ ترغیب دی ہے اسی طرح آپ نے بد دُعا کرنے سے روکا بھی ہے۔ آپ نے فرمایا اپنے لئے اور اپنی اولاد کے لئے اور اپنے مال وجائداد کے لئے بد دُعا نہ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ ایسی گھڑی ہو کہ جس میں اللہ دعاؤں کو قبول کرتا ہو اور اللہ تعالیٰ تمہاری بد دعا قبول کر لے۔"

اس دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہوتا ہے۔ اللہ کی مشیت کے سامنے بندہ مجبور و بے بس ہے۔ اس لئے بار بار ہر معاملہ میں اللہ کی طرف رجوع کرنا چاہیئے اور اس سے گڑگڑا کر دُعا مانگنا چاہیئے۔ بلاشبہ یہ دنیا عالم اسباب ہے اور یہاں ہر کام کے لئے تدبیر کرنا ضروری ہے محض دُعاؤں سے کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ خود اللہ تعالیٰ نے تدبیر اور جد وجہد کا حکم دیا ہے۔

لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۔ انسان کو وہی کچھ ملے گا جس کی وہ کوشش کرے گا۔ (پ ۲۷ رکوع ۶)

لیکن تدبیر اور جد وجہد کو پایۂ تکمیل تک پہونچانا اور کامیاب بنانا اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اس لئے اس سے دُعا کئے بغیر چارہ نہیں۔ بندۂ مومن نہ تدبیر

کرنے میں کوئی کسر اٹھا رکھتا ہے اور نہ دعا کرنے میں۔ اس کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ رہتا ہے۔

آپ جو کام کرنا چاہتے ہیں اس کے لئے اپنی پوری قوت صرف کر دیتے ہیں اور تمام تدابیر زیر عمل لانے میں کمی نہ کیجئے، لیکن اپنی تدبیروں پر بھروسہ کرنے کے بجائے صرف اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیجئے اور انتہائی عاجزی سے دُعا کرتے رہیئے یہانتک کہ وہ کام پورا ہو جائے۔"

فکر آخرت

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ کَانَتِ الْاٰخِرَۃُ ھَمَّہٗ جَعَلَ اللّٰہُ غِنَاہُ فِیْ قَلْبِہٖ وَ جَمَعَ لَہٗ شَمْلَہٗ وَ اَتَتْہُ الدُّنْیَا وَھِیَ رَاغِمَۃٌ۔ وَ مَنْ کَانَتِ الدُّنْیَا ھَمَّہٗ جَعَلَ اللّٰہُ فَقْرَہٗ بَیْنَ عَیْنَیْہِ وَ فَرَّقَ عَلَیْہِ شَمْلَہٗ وَ لَمْ یَاْتِہٖ مِنَ الدُّنْیَا اِلَّا مَا قُدِّرَ لَہٗ۔ (ترمذی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جس شخص کا غم اور فکر آخرت ہو، اس کے دل میں اللہ تعالیٰ غنا بھر دیتا ہے اور اس کے حالات کو درست کر دیتا ہے اور دنیا اس کے پاس ذلیل وخوار ہو کر آتی ہے۔ اور جس شخص کی فکر دُنیا ہو اللہ تعالیٰ اس کے فقر و محتاجی کو اس کی آنکھوں کے سامنے کر دیتا ہے اور اس کے حالات کو منتشر کر دیتا ہے اور دُنیا اُسے اتنی ہی ملتی ہے جتنی مقدر ہو چکی ہے۔

تشریح: خدا پر ایمان لانے کے بعد اس حقیقت کو نہیں بھولنا چاہیئے کہ موجودہ زندگی اس کی آخری زندگی نہیں ہے بلکہ اس کے بعد ایک دوسری زندگی آنے والی ہے جس میں اس کو اپنے ایک ایک عمل کا حساب دینا ہے اور جو شخص

یہ نہ سمجھتا ہو کہ اسے مر کر دوبارہ اٹھنا ہے اور اپنے خدا کے سامنے ایک ایک عمل کا حساب دینا ہے تو وہ لازماً گمراہ ہو کر رہے گا کیونکہ اس یقین کے بغیر اس کے اندر ذمہ داری کا وہ احساس پیدا نہ ہو سکے گا جو آدمی کو سیدھے راستہ پر جماتا ہے۔ اسی لئے شیطان کا سب سے بڑا پھندہ جس میں وہ انسان کو پھانستا ہے یہ ہے کہ وہ اسے آخرت سے غافل اور لاپرواہ کر دے۔ اور اس کی ساری دلچسپیوں کا مرکز دُنیا اور اس کے عیش و آرام اور اس کے مال و دولت کو بنا دے۔ شیطان کے فریب سے جو بچ نکلے وہ کبھی اس بات پر راضی نہ ہو گا کہ اپنی اصلی اور ہمیشہ رہنے والی زندگی کے فائدوں کو چھوڑ کر دنیا کی عارضی زندگی کے فائدوں کے پیچھے پڑ جائے۔ لیکن جو شخص شیطان کے دھوکے میں آ کر اور اس کے فریب کا شکار ہو کر آخرت کی زندگی کا انکار کر دے یا اس کے بارے میں کسی شک میں مبتلا ہو جائے یا اس سے غافل ہو جائے وہ ہرگز اس بات کے لئے تیار نہ ہو گا کہ سامنے نظر آنے والے فائدوں سے ہاتھ اٹھالے اور جو لذتیں فوراً مل سکتی ہیں ان پر نہ ریجھے۔ وہ کبھی یہ نہ سوچے گا کہ اُسے ان باتوں کا کوئی نقصان بعد کی زندگی میں بھگتنا پڑیگا۔ آپ ذرا بھی غور کریں گے تو آسانی سے یہ سمجھ لیں گے کہ دُنیا میں جو شخص بھی گمراہ ہُوا ہے وہ آخرت کا انکار کرنے، یا اس کے بارے میں شک میں مبتلا ہونے یا اس کی طرف سے غفلت اور بے فکر ہونے کی وجہ سے ہوا ہے۔ اور جس شخص کو سیدھے راستہ پر چلنا اور جمنا نصیب ہوا ہے اس کے صحیح طرزِ عمل کی بنیاد "فکرِ آخرت اور ایمان بالآخرت" ہی پر قائم ہوتی ہے۔

آخرت پر ایمان اسلام کے بنیادی عقیدوں میں سے ایک عقیدہ ہے۔ جب تک اس عقیدے کے صحیح ہونے پر اطمینان نہ ہو جائے اور اسے قبول

نہ کرے وہ مسلمان ہی نہیں ہوتا۔ اسی سے زندگی کا رُخ پلٹتا ہے، اسی سے انسان کے سامنے قبول کرنے اور رد کر دینے کے مقررہ پیمانے آتے ہیں اور اسی سے انسان کا طرزِ عمل متعین ہوتا ہے۔ ہمیں اس عقیدے اور اس کی اہمیت کو اچھی طرح محسوس کرنا چاہیئے اور اس کے بارے میں کسی ذہنی الجھن یا غفلت کا شکار نہ ہونا چاہیئے اور اپنی جملہ مساعی وافکار کا مرکز فکرِ آخرت کو بنانا چاہیئے۔ اسی طرف حدیث بالا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا ہے کہ انسان کو چاہیئے کہ اپنی تمام فکر اور مساعی حصول آخرت کے لئے صرف کرے، اس سے اسکو قلبی سکون حاصل ہوگا۔ ذہنی انتشار میں مبتلا نہ ہوگا، دُنیا کی قدر و قیمت اس کے نزدیک چنداں نہ ہوگی" ——— اور جس کی ساعی اور فکر وغم حصول دنیا کے لئے ہو تو فقر و محتاجی اسکی آنکھوں کے سامنے مہیب شکل میں ہوگی جس سے وہ سخت ذہنی انتشار میں مبتلا ہوگا اور وہ پوری پوری کوشش کرے گا کہ اُسے زیادہ سے زیادہ سامانِ زیست وعیش وعشرت حاصل ہو۔ مگر ان تمام کوششوں، محنتوں اور جانکاہیوں کے علی الرغم دنیا اسے اتنی ہی ملے گی جتنا رب نے دینے کا فیصلہ کیا ہے

ایک اور موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

مَنْ اَحَبَّ دُنْيَاهُ اَضَرَّ بِاٰخِرَتِهٖ وَمَنْ اَحَبَّ اٰخِرَتَهٗ اَضَرَّ بِدُنْيَاهُ، فَاٰثِرُوْا مَا يَبْقٰى عَلٰى مَا يَفْنٰى۔	جو شخص اپنی دُنیا سے محبت کریگا وہ اپنی آخرت کو نقصان پہونچائے گا۔ اور جو اپنی آخرت سے محبت کرے گا وہ اپنی دُنیا کو نقصان پہونچائے گا۔ تو تم باقی رہنے والی (آخرت) کو فنا ہونے والی (دُنیا) پر ترجیح دو۔

(احمد، بیہقی کذا فی المشکوٰۃ)

دُنیا میں مشغولی اور آخرت فراموشی کی تصویر کشی نبی صلی اللہ علیہ وسلم

نے اس طرح فرمائی ہے :

هَلْ مِنْ اَحَدٍ يَمْشِيْ عَلَى الْمَاءِ اِلَّا ابْتَلَّتْ قَدَمَاهُ؟ قَالُوْا لَا يَا رَسُوْلَ اللهِ۔ قَالَ كَذَالِكَ صَاحِبُ الدُّنْيَا لَا يَسْلَمُ مِنَ الذُّنُوْبِ۔	کیا کوئی ایسا بھی ہے جو پانی پر چلے اور اس کے پیر نہ بھیگیں، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ایسا کوئی بھی نہیں ہے جو پانی پر چلے اور اس کے پیر نہ بھیگیں۔ پھر آپ نے فرمایا کہ یہی مثال دنیا دار کی ہے کہ وہ بھی گناہ سے محفوظ نہیں رہ سکتا

ایک اور حدیث میں ہے ۔

قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ اَحَدٍ يَمُوْتُ اِلَّا نَدِمَ قَالُوْا وَمَا نَدَامَتُهُ يَا رَسُوْلَ اللهِ؟ قَالَ اِنْ كَانَ مُحْسِنًا نَدِمَ اَنْ لَا يَكُوْنَ ازْدَادَ وَاِنْ كَانَ مُسِيْئًا نَدِمَ اَنْ لَا يَكُوْنَ نَزَعَ۔ (ترمذی)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص بھی اس دنیا سے کوچ کریگا وہ نادم ہوگا ۔صحابہؓ نے عرض کیا حضور! مرنیوالے کی ندامت کس وجہ سے ہوگی ؟ آپ نے فرمایا اگر مرنے والے نے اپنی زندگی نیکی اور احسان کیساتھ گذاری ہوگی تو اسے یہ ندامت ہوگی کہ اس نے اور زیادہ ترقی کیوں نہ کی اور اگر وہ بدعمل ہوگا تو وہ پشیمان ہوگا کہ اس نے برے اعمال سے کنارہ کشی کیوں نہ کی ۔

زندگی کا مسافر اپنی منزلیں طے کرتا ہوا جب گھر پہونچتا ہے تو وہ حساب کرتا ہے کہ اس نے اس سفر میں کیا کھویا اور کیا پایا۔ وہ شمار کرتا ہے کہ اس نے دس ، بیس تیس . چالیس . پچاس ، ساٹھ سال کا لمبا سفر طے کیا ہے ، اس سفر میں اس کی صحت ، اس کی توانائی ، اور اس کی صلاحیتیں صرف ہوئی ہیں ۔ اس نے نقد جان اس سفر میں ہاری ہے ۔ اب جبکہ یہ سب کچھ ہار چکا ہے تو دیکھتا ہے کہ

اس کے پلّے کیا ہے، اس نے سب کچھ لُٹا کر کیا پایا ہے اور سب سے ہاتھ دھو کر کیا حاصل کیا ہے؟

اس حساب واحتساب سے جو حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے اس کی رُو سے تمام انسان دو حصّوں میں بٹ جاتے ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جن کی زندگیاں اس بھول میں گذریں کہ انھوں نے سفر کو قیام اور راستے کو منزل سمجھ لیا اور دُنیا کی دلفریبی میں کھو گئے اور انھوں نے دُنیوی لذتوں، اپنے نفس کی خواہشوں اور اپنی فانی آرزوؤں کو حاصل زندگی قرار دیا اور نیک وبد کی تمیز کئے بغیر اس بات میں مصروف ہو گئے کہ نفس کے تقاضوں کو پورا کریں۔ آج جب مسافر حساب کرنے بیٹھا ہے تو یہ دیکھ کر کہ اُن پر حسرت واندوہ کی بے چینیاں مسلّط ہوتی جارہی ہیں کہ نہ وہ کسی لذت کا احساس پاتے ہیں اور نہ کسی خواہش کی تکمیل کا کوئی لطف آج ان کی تسکین کا ذریعہ بن رہا ہے یہ تمام چیزیں تو دنیا میں حاصل ہوئیں اور وہیں رہ گئیں۔ البتہ آج جو چیزیں ان کے دامن میں پائی جاتی ہیں وہ یہ ہیں کہ انھوں نے اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے لوگوں پر جو ظلم کئے تھے، اپنی نفسانی لذتوں کے حصول کے لئے جو حق تلفیاں ان سے سرزد ہوئی تھیں اور انھوں نے اپنے عیش وآرام کے لئے اپنے خالق ومالک کے حقوق میں جو کوتاہیاں کی تھیں یہ سب آج ان کے نامۂ اعمال میں موجود ہیں اور یہ ان کے بوجھ تلے دبے جارہے ہیں۔

جب یہ غلط کار لوگ اپنی زندگی کی یہ کمائی اپنے سامنے دیکھتے ہیں تو حسرت اور اندوہ سے ان کی کمریں ٹوٹی جارہی ہیں اور ان کے دل بیٹھے جارہے ہیں اور پچھتا رہے ہیں کہ انھوں نے اپنی زندگی کو کیوں غلط استعمال کیا، انھوں نے اپنی قابلیتوں اور صلاحیتوں کو کیوں نہ اس طرح صرف کیا کہ ان کا مالک ان سے راضی

ہو جاتا اور ان کا دامن مُراد اپنی رحمتوں اور انعامات سے بھر دیتا۔ یہ حسرت واندوہ، ندامت اور پشیمانی تو ان کی تھی جو بدکردار تھے، خواہشات کے بندے تھے اور نیک و بد کا امتیاز کھوکر زندگی بھر غلط کاموں میں مصروف رہے اور آج ان کی نیکیاں کم اور برائیاں زیادہ نکلیں۔

لیکن اس منزل پر پہونچنے والا ایک اور دوسرا گروہ بھی ہے جو بدقماش تھا اور نہ بدعمل، نہ اس نے خواہشات نفس کی غلامی میں اپنی زندگی گنوائی اور نہ ہی اس نے اپنے رب کے احکام پر اپنے عیش ونشاط کو ترجیح دی۔ اس گروہ کے افراد وہ ہیں جو اپنے رب کی عبادت کو انجام دیتے رہے جو اس کے حضور سجدے کرتے رہے اور جن کی زندگیوں کا خاص عنوان تھا اپنے رب کی رضا کا حصول۔ یہ لوگ جب حساب کریں گے تو اس سے خوش ہوں گے کہ آج ان کا سرمایۂ زندگی نافرمانی اور معصیت نہیں ہے اور وہ اس پر اپنے رب کے شکر گذار ہوں گے کہ اس نے انھیں زندگی کو صحیح طور پر گذارنے کی توفیق دی۔ لیکن ایک چیز انھیں پریشان کر رہی ہوگی کہ انھوں نے اپنے رب کی عبادت گذاری، اپنے آقا کے حکم کی تکمیل اور اپنے پیدا کرنے والے کی رضا کے حصول میں اتنی جدّوجہد نہیں کی جتنی جدّوجہد ایک ایسے شخص کو کرلینی چاہیئے تھی جو دنیا کی زندگی کو سفر اور آخرت کی زندگی کو منزل سمجھتا ہے۔ اور جس نے دُنیا کی زندگی کو ایک ایک دن اور یہاں کی مدّت کا ایک ایک لمحہ اس تصور سے گذارا ہو کہ اس لمحہ میں جو نیکی کرے گا کل اس کے کام آئے گی۔ یہ شخص دیکھے گا کہ اس نے زندگی کے بہت سے اوقات آرام میں گذارے، بہت سی گھڑیاں بے مقصد باتوں میں ضائع کردیں، کئی دن ایسے گذرے کہ سُستی اس پر غالب رہی، کئی راتیں ایسی کٹیں کہ بے مقصد کتابوں کو پڑھتا رہا۔ لایعنی مجلسوں میں مصروف رہا، اور وہ یہ بھی

محسوس کرے گا کہ میں معمولی سی دھوپ، تھوڑی سی گرمی، ہلکی سی سردی کی وجہ سے اپنے رب کی عبادتوں کو اس طرح نہ ادا کر سکا جس طرح کرنا چاہیئے تھا۔ میں دین کی سربلندی کے لئے آرام، آسائش اور مال کا ایثار نہ کر سکا جتنا میری استطاعت میں تھا۔ یہ احساس اسے پشیمان کرے گا۔ اور وہ پچھتائے گا کہ اُس نے محنت کیوں نہ کی کہ آج اسے اچھے سے اچھا نتیجہ ملتا۔ کیوں نہ اس نے بھوک، تھکاوٹ، سردی گرمی اور جسمانی مشقت کو برداشت کیا کہ آج اسے جنّاتِ نعیم کی ان نعمتوں سے نوازا جاتا جو ان لوگوں کو بڑی فراوانی سے مِل رہی ہیں جنھوں نے اس کی راہ میں صعوبتیں برداشت کی تھیں اور آج انہی کی بدولت وہ اونچے درجات پر فائز ہیں۔

دانشمند کون ہے؟

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْکَیِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَہٗ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ وَ الْعَاجِزُ مَنْ اَتْبَعَ نَفْسَہٗ ھَوَاھَا وَتَمَنّٰی عَلَی اللّٰہِ۔ (ترمذی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دانشمند وہ شخص ہے جو اپنے نفس کو قابو میں رکھے اور موت کے بعد کی زندگی کیلئے عمل کرے۔ اور وہ شخص ناکارہ ہے جس نے اپنے نفس کو خواہشات کا پیرو بنا دیا اور اس کے باوجود اللہ سے امیدیں باندھے۔

تشریح: دنیا میں وہ شخص عقلمند مانا جاتا ہے جو ان مصیبتیں اٹھا کر کل کے آرام کی فکر کرے۔ اور اس شخص کو انتہائی نادان اور ناکارہ سمجھا جاتا ہے جو اپنے آرام کی خاطر اپنے مستقبل کو تباہ کرے۔ افراد اور قوموں کی ترقی اور سربلندی کا راز حال کی قربانی اور مستقبل کی تعمیر میں ہے۔ اسی اصول کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیوی اور اُخروی زندگی پر منطبق کیا ہے۔ جو شخص آخرت کا انکار کرتا ہوا اس کی

بات دوسری ہے جو چاہے کرے۔ لیکن مسلمان کا ایمان ہے کہ دنیا کی یہ زندگی چند روزہ اور فانی ہے۔ ہر انسان کو مرنا ہے اور پھر ساری کائنات کو فنا ہونا ہے اور اس کے بعد ایک دور آئے گا جب کہ یہ کائنات دوبارہ بنائی جائے گی۔ انسان دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔ اور یہ کائنات اور انسان کی یہ زندگی دائمی اور لازوال ہوگی۔ اس عالم میں تمام انسان اللہ تعالیٰ کی عدالت میں حاضر ہوں گے وہاں تمام انسانوں کی ساری زندگی کا ریکارڈ پیش ہوگا۔ فرشتے۔ زمین، زمین پر بسنے والے انسان اور انسانی اعضاء انسان کے حق میں یا اس کے خلاف گواہی دیں گے۔ فیصلہ صادر فرمانے والا اللہ ہوگا، جس کے سامنے کسی کو دَم مارنے کا یارا نہ ہوگا۔ وہ نیک۔ خدا ترس اور باکردار انسانوں کے لئے جنت کی ابدی اور بے پایاں نعمتوں کا فیصلہ فرمائے گا اور کفار و مشرکین اور فاسق و فاجر انسانوں کے ہولناک جہنم کے عذاب کا۔

آخرت میں یا تو بے مثال نعمتوں اور بے پایاں سکھ سے بھری ہوئی ابدی زندگی ہوگی۔ یا ہولناک عذابوں اور ناقابل برداشت دکھوں سے بھری ہوئی دائمی زندگی۔ اور ہر انسان اپنے ایمان و عمل کے مطابق ان میں سے کوئی ایک زندگی پائے گا۔ اگر یہ ایک حقیقت ہے اور اس کے حقیقت ہونے میں کوئی شبہ نہیں تو دانش مند شخص وہی ہے جو آخرت کی بے پایاں اور ابدی کامرانی کی فکر کرے۔ دنیا کی رنگینیوں اور خواہشات نفس میں پھنسنے کے بجائے اپنے آپ پر قابو پائے۔ اور جو کام بھی کرے اللہ کی رضا اور آخرت کی کامیابی کے لئے کرے۔ اس کے برعکس وہ شخص انتہائی ناکارہ اور نادان ہے جو دنیا کی چند روزہ رنگینیوں میں پھنس جائے۔ اپنے آپ کو خواہشات نفس کے حوالے کر دے۔ اُخروی کامیابی کی جدوجہد کرنے کے بجائے دنیا پرستی میں غرق ہو جائے اور پھر بھی وہ یقین رکھے کہ اللہ تعالیٰ اس سے ناراض نہ ہوگا اور دنیا

میں اپنی نصرت اور آخرت میں جنّت کی ابدی نعمتوں سے سرفراز فرمائے گا۔ ایسا شخص جب اللہ تعالیٰ کے رُوبرو پہونچے گا تو اُس پر یہ منکشف ہو جائے گا کہ یہ محض اس کی خوش فہمی تھی۔ دنیا اپنی رنگینیوں سمیت فنا ہو چکی ہو گی جہنم اپنے ہولناک عذاب کے ساتھ اس کے سامنے منھ کھولے کھڑی ہو گی اور وہ جہنم میں جھونک دیا جائیگا۔

توبہ و استغفار

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا اَخْطَأَ خَطِیْئَۃً نُکِتَتْ فِیْ قَلْبِہٖ نُکْتَۃٌ سَوْدَاءُ، فَاِذَا هُوَ نَزَعَ وَاسْتَغْفَرَ وَتَابَ صُقِلَ قَلْبُہٗ وَاِنْ عَادَ زِیْدَ فِیْهَا حَتّٰی تَعْلُوَ قَلْبَہٗ وَهُوَ الرَّانُ الَّذِیْ ذَکَرَ اللّٰہُ کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَاکَانُوْا یَکْسِبُوْنَ۔

(ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب بندہ کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک سیاہ نشان پڑ جاتا ہے پھر جب وہ گناہ سے باز آجاتا ہے اور (اللہ سے) مغفرت چاہتا ہے اور توبہ کرتا ہے تو اس کا دل پاک وصاف ہو جاتا ہے لیکن اگر وہ پھر گناہ کرتا ہے تو یہ سیاہ نشان اور بڑھ جاتا ہے یہاں تک کہ (بڑھتے بڑھتے) اس کے دل پر چھا جاتا ہے اور یہی وہ ران (زنگ) ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے اس طرح ذکر کیا ہے "ہرگز نہیں! اصلی حقیقت یہ ہے کہ جو غلط کاریاں وہ کرتے رہے ہیں وہ ان کے دلوں پر زنگ بن کر چھا گئی ہیں۔"

تشریح:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ "بندہ جب گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک سیاہ نشان پڑ جاتا ہے"۔ سیاہ نشان سے مراد کوئی مادی نشان، یا داغ دھبہ نہیں ہے بلکہ وہ باطنی اثر ہے جو نافرمانی کی وجہ سے انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے

جس کے نتیجہ میں انسان کے اندر اللہ کی اطاعت کا مادہ کم اور اس سے دوری بڑھ جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی کیفیت ہے جسے ہر صاحبِ احساس جو کسی بھی گناہ میں مبتلا ہو جائے بخوبی محسوس کر سکتا ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اللہ کی کوئی ایک نافرمانی محض اللہ کی ناخوشی اور عذابِ آخرت ہی کی موجب نہیں ہے بلکہ اس سے انسان کا دل بُری طرح متاثر ہوتا ہے۔ وہ دل جو انسان کے بدن میں تمام افکار و اعمال کا مرکز ہے اور جس کی درستی اور جس کا خشوع سب سے زیادہ مطلوب ہے اور انسان ایک دوسری نافرمانی کی طرف بڑھنے کے خطرے میں گھر جاتا ہے (اور یہ نافرمانی کا خاصہ ہے خواہ چھوٹی ہو یا بڑی۔ زیادہ بڑے اور مہلک اثرات مرتب ہوتے ہیں اور چھوٹے گناہ سے نسبتاً مہلک اثرات)۔

اس حدیث میں "نزع" "استغفر" اور "تاب" کے الفاظ آئے ہیں در اصل یہی توبہ کے شرائط اور اجزاء ہیں۔ "نزع" کے معنی یہ ہیں کہ انسان کسی کام سے باز آگیا، رُک گیا، یہ توبہ کی پہلی اور بنیادی شرط ہے۔ اگر انسان زبان سے توبہ توبہ کرتا رہے اور گناہ سے باز نہ آئے تو یہ ہرگز توبہ نہ ہوگی۔ اور باز آجانے سے مُراد ظاہر و باطن دونوں اعتبار سے باز آجانا ہے۔ یعنی انسان کا دل اس گناہ سے نفرت کرنے لگے اور اس کا ارادہ ترک کر دے اور اس کے اعضاء بھی اس گناہ میں ملوث نہ ہوں۔ اگر انسان اس گناہ کا ارادہ کرتا رہا مگر مواقع نہ ہونے کی بنا پر گناہ کا ارتکاب نہ کر سکا تو یہ توبہ نہیں ہے بلکہ قلب و دماغ کی حد تک یہ گناہ کا ارتکاب ہی ہے۔ اسی طرح اگر دل و دماغ سے گناہ کے ترک کا ارادہ کر لیا مگر عملاً گناہ میں ملوث ہو گیا تو بھی یہ توبہ نہیں ہوئی۔ توبہ یہ ہے کہ انسان کا ظاہر و باطن دونوں گناہ کے ارادہ و عمل سے دُور رہے۔

دوسرا لفظ استغفر ہے جس کے معنی ہیں مغفرت چاہی۔ یعنی صرف گناہ سے رک جانا کافی نہیں ہے بلکہ اللہ کی نافرمانی کو نافرمانی سمجھ کر اس پر نادم ہو، اور اس کے ہولناک انجام سے ڈرتا ہے اور خلوص دل کے ساتھ اللہ سے اس بات کی التجا کرے کہ وہ اس کو اس گناہ پر عذاب نہ دے بلکہ اپنے رحم وکرم سے معاف کر دے۔ یہ کیفیت جس قدر زیادہ ہوگی اسی قدر توبہ صحیح معنی میں توبہ ہوگی اور اسی قدر انسان اللہ کی نافرمانی سے بچے گا۔

تیسرا لفظ "تاب" ہے، اس کے معنی ہیں "پلٹا" "رجوع کیا" "متوجہ ہوا"۔ یعنی اتنا کافی نہیں ہے کہ انسان گناہ سے باز آجائے اور مغفرت کا طالب ہو۔ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اللہ سے اپنے ٹوٹے ہوئے رشتے کو پھر سے جوڑے۔ اور اپنے مالک وآقا سے عہد بندگی کی تجدید کرے۔ اپنے رب کی اطاعت کرنے اور اس کی وفاداری کے تقاضے پورے کرنے میں سرگرمی کے ساتھ لگ جائے۔ توبہ کی حقیقت یہی ہے اور کسی گناہ کے بعد جس قدر یہ کیفیت ابھرے گی اسی قدر اس بات کی توقع کی جا سکتی ہے کہ انسان کی غلطی معاف ہو جائے۔ اس کا دل پاک وصاف ہو جائے اور وہ پہلے سے زیادہ اللہ سے قریب ہو سکے۔ بندہ جب گناہ سے باز آجاتا ہے اور (اللہ سے) مغفرت چاہتا ہے اور توبہ کرتا ہے تو اس کا دل پاک وصاف ہو جاتا ہے؛ یعنی نافرمانی سے انسان کے دل میں جو گندگی پیدا ہوگئی تھی استغفار سے وہ گندگی زائل ہو جاتی ہے۔ اور گناہ کرنے کی وجہ سے قلب کے اندر خشوع اور جذبۂ عبودیت میں جو کمی آگئی تھی وہ توبہ سے دور ہو جاتی ہے اور انسان کا دل اللہ کی بندگی کے صالح جذبات سے معمور ہو جاتا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ توبہ انسان کی نجات اور اس کی خامیوں کے دور کرنے اور اس کے ارتقاء کے لئے کس قدر ضروری ہے۔

لیکن اگر وہ پھر گناہ کرتا ہے تو یہ سیاہ نشان اور بڑھ جاتا ہے "یعنی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی دوبارہ کرنا انسان کے دل کی قساوت اور اس کی تاریکی کو اور بڑھا دیتا ہے جس کے نتیجہ میں انسان اللہ کی بندگی کی راہ سے دور ہوتا چلا جاتا ہے اور اطاعت کی راہ پر چلنا اس کے لئے دشوار سے دشوار تر ہوتا جاتا ہے یہانتک کہ یہ اثر بڑھتے بڑھتے اس کے پورے دل پر چھا جاتا ہے " بالفاظ دیگر اگر انسان مسلسل نافرمانی کرتا رہے اور توبہ کی توفیق اسے نصیب نہ ہو تو اس کے دل کی سیاہی رفتہ رفتہ بڑھتی رہتی ہے یہاں تک کہ وہ دن آجاتا ہے کہ جب یہ سیاہی دل پر چھا جاتی ہے اور اس کی بصیرت کو ختم کر کے رکھ دیتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اللہ کی نافرمانی کے اندر پوری طرح ڈوب جاتا ہے اور اس مقام پر پہونچنے کے بعد اس کا پلٹنا اور اصلاح کی توفیق پانا سخت دشوار ہو جاتا ہے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بات کی تائید میں سورۂ تطفیف کی وہ آیت تلاوت فرمائی جس میں کفار کی وہ بنیادی خرابی بیان کی گئی ہے جس کی وجہ سے وہ اللہ کے دین کو قبول نہیں کر رہے تھے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشاد میں اس آیت کا ذکر گنہ گار مسلمانوں کے سلسلہ میں کیا ہے۔ جس سے یہ بات واضح کرنا مقصود ہے کہ جس طرح حق کو حق جانتے ہوئے اس سے مسلسل اعراض کرنے کی وجہ سے اہل کفر کے لئے اب ہدایت الٰہی کا قبول کرنا سخت مشکل ہو رہا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اللہ کے دین کو قبول کرے مگر عملاً مسلسل اس کی خلاف ورزی کرتا چلا جائے تو اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ مسلسل نافرمانی کے نتیجہ میں ایک وقت ایسا آجائے کہ اس کے لئے اللہ کے دین پر عمل کرنا اور اس سے اپنا تعلق برقرار رکھنا سخت مشکل ہو جائے۔ جس شخص کو اپنا دین و ایمان عزیز ہو اور جسے آخرت کا ذرا بھی اندیشہ ہو وہ اس خطرے کو مول لینے کی جرأت کر سکتا ہے؟

ظاہر ہے کہ نہیں اور یقیناً نہیں!! تو پھر کسی مومن کو نہ اللہ کی نافرمانی پر جری ہونا چاہیئے اور نہ توبہ کی طرف سے غافل۔

ایک اور موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے ہر ابن آدم خطا کار ہے اور خطا کاروں میں سے بہتر بن آدمی وہ ہے جو زیادہ سے زیادہ توبہ کرتا ہو

اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ایک یہ کہ ہر انسان خطا کار ہے کسی انسان کا اپنے بارے میں یہ خیال کرنا کہ وہ غلطیوں اور گناہوں سے پاک ہے خود بہت بڑی غلطی ہے۔انبیاء علیہم السلام کے سوا اللہ تعالیٰ کی خصوصی نگرانی اور تربیت کے نتیجہ میں گناہوں سے محفوظ رہنے میں باقی تمام انسانوں کے بارے میں یہ اندیشہ لگا رہتا ہے کہ ان سے کسی چھوٹے بڑے گناہ کا صدور نہ ہو جائے۔اس لیئے ہر شخص کو اپنا کڑا جائزہ لیتے رہنا چاہیئے اور یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس سے کونسی غلطی ہوئی

حدیث سے دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ انسان سے یہ بات مطلوب نہیں ہے کہ اس سے کبھی بھی غلطی نہ ہو۔بلکہ یہ ہے کہ اگر خدا نخواستہ اس سے غلطی ہو جائے تو فوراً اس سے باز آجائے اور اللہ کا دامن پھر مضبوطی کے ساتھ تھام لے۔

قرآن مجید اور صحیح احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے جلیل القدر انبیاء و رُسُل بھی اللہ کے خوف سے کانپتے رہتے اور دن رات اللہ کے حضور توبہ و استغفار میں لگے رہتے تھے۔صحیح احادیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ سے زیادہ سے زیادہ استغفار کرو کیونکہ میں بھی دن میں ستر بار سے زیادہ استغفار کرتا ہوں۔ایک اور روایت میں سو بار کا ذکر آیا ہے۔ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا "میرے دل پر ایک پردہ سا پڑ جاتا ہے اور میں ستر بار سے زیادہ استغفار کرتا ہوں۔اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رسمی استغفار نہیں

فرماتے تھے بلکہ جب بھی وہ یہ محسوس کرتے کہ ان کے دل کی اعلیٰ و مثالی کیفیت نہیں ہے جو اُن جیسے جلیل القدر رسول کی ہونی چاہیئے تو وہ اللہ کے حضور استغفار میں لگ جانے اور قلب کی اس کیفیت کو ایک غلطی خیال کرکے اس سے توبہ کرنے لگتے۔

ایک اور موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "جو شخص استغفار کا التزام کرے گا اللہ تعالیٰ اسے ہر تنگی اور پریشانی سے نجات دے گا، اس کے ہر غم کو دور کریگا اور اُسے اُن راہوں سے رزق دیگا جن کا اسے خیال و گمان تک نہ ہوگا۔

استغفار کے التزام کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان بلا سوچے سمجھے یونہی استغفراللہ کا ورد کرتا رہے۔ یہ چیز نہ مطلوب ہے اور نہ شرعاً و عقلاً وہ نتائج ہی مرتب ہو سکتے ہیں جن کا اس حدیث میں ذکر ہے۔ اور نہ اس ورد کو استغفار کا ورد کہہ سکتے ہیں۔ استغفار کے معنی استغفراللہ کے ورد کے نہیں ہیں۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ سے اپنی غلطیوں کی خلوص دل کے ساتھ معافی چاہی جائے۔ اور استغفار کے التزام کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی غلطیوں کو پوری طرح محسوس کرکے اللہ سے ان کی مغفرت چاہنے میں مسلسل لگا رہے اور یہ صورت اسی وقت ممکن ہے جبکہ:

(۱)۔ انسان کو اس کی مثالی زندگی کا علم و استحضار ہو جو اللہ کو محبوب و مطلوب ہے، اور انسان اس زندگی کو اپنانے کا فیصلہ کرلے۔

(۲)۔ انسان اس آئینہ میں اپنے آپ کو بار بار دیکھے اور اپنا شدید احتساب کرتا رہے تاکہ اس میں اپنی کوتاہیوں کا حقیقی اور واقعی احساس پیدا ہو۔

(۳)۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ انسان کا دل محبتِ الٰہی اور خوف آخرت کے جذبات سے پرُ ہو۔ تاکہ انسان کو اس کی غلطیاں مضطرب و بے چین کرکے

رکھ دیں اور وہ انتہائی ندامت وشدتِ خشیت کے ساتھ اللہ سے اپنی غلطیوں کی معافی چاہنے اور آئندہ کے لئے ان سے بچے رہنے کا عہد کرنے پر اپنے آپکو مجبور پائے۔ گویا استغفار کے التزام کا مطلب یہ ہوا کہ توبہ واستغفار سے نہ صرف یہ کہ پچھلے گناہ معاف ہوجاتے ہیں بلکہ اگر توبہ حقیقی معنی میں توبہ ہے تو وہ اللہ سے بندے کے تعلق کو ازسرِنو مستحکم کردیتی ہے، عہد بندگی کی تجدید کرتی ہے۔ اللہ کی راہ پر انسان کو تیزگام بناتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ توبہ کرنے والا اللہ تعالیٰ کو انتہائی محبوب ہے۔ اور توبہ کرنے سے اللہ تعالیٰ بے حد خوش ہوتا ہے۔

صحیح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالےٰ اپنا ہاتھ رات کو پھیلاتا ہے تاکہ دن میں گناہ کرنے والا توبہ کرلے، اور اپنا ہاتھ دن میں پھیلاتا ہے تاکہ رات کا گناہ کرنے والا توبہ کرلے، یہ اس وقت تک ہے جب تک کہ سورج مغرب سے نکلے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ سے جب وہ اس کے حضور توبہ کرتا ہے اس شخص سے زیادہ خوش ہوتا ہے جو صحرا دبیابان میں اپنی اونٹنی پر سفر کررہا ہو اور اس اونٹنی پر اس کا کھانا پینا ہو، وہ اونٹنی کہیں بھاگ جائے اور وہ اسے ڈھونڈھ کر اس کے ملنے سے مایوس ہوجائے اور ایک درخت کے نیچے آکر لیٹ رہے تو اس اثنا میں کہ وہ اونٹنی سے مایوس لیٹا ہوا ہو اونٹنی اچانک اس کے پاس آکر کھڑی ہوجائے وہ اس کی لگام پکڑے اور مارے خوشی کے کہہ اٹھے کہ اے اللہ تو میرا بندہ ہے اور میں تیرا رب ہوں۔ خوشی کے مارے بات الٹی کہہ جائے۔ یہ بندہ اونٹنی پاکر جس قدر خوش ہوا، توبہ کرنے سے اللہ تعالیٰ کہیں زیادہ خوش ہوتا ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا "بنی اسرائیل میں ایک آدمی تھا جس نے ننانوے ۹۹ آدمیوں کو قتل کیا تھا پھر وہ اپنی توبہ کے سلسلہ میں لوگوں سے پوچھنے نکلا۔ چنانچہ وہ ایک راہب کے پاس آیا اس نے اس سے سوال کیا کہ کیا میری توبہ قبول ہو سکتی ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ اس شخص نے اس راہب کو بھی قتل کر دیا، اور پھر لوگوں سے اپنی توبہ کے بارے میں پوچھنے لگا۔ اس سے ایک آدمی نے کہا کہ فلاں بستی میں جاؤ (شاید وہاں تمہاری توبہ کی کوئی شکل آئے) اس نے اس بستی کا سفر شروع کیا مگر اسے راستے ہی میں موت آگئی اور وہ چلتے چلتے گر پڑا مگر وہ اپنے سینے کے بل بستی کی طرف گرا۔ اس کی روح کے سلسلہ میں رحمت اور عذاب کے فرشتوں میں جھگڑا ہونے لگا تو اللہ تعالیٰ نے گاؤں والی زمین سے کہا بندہ سے قریب ہو جا، اور جس جگہ سے وہ چلا تھا اس جگہ کی زمین سے کہا کہ تو دور ہو جا۔ پھر فرشتوں سے کہا دونوں فاصلے ناپ لو، تو وہ توبہ والے گاؤں سے ایک بالشت کے بقدر قریب نکلا اور اس کی مغفرت فرما دی گئی"۔

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ سچی اور مخلصانہ توبہ اللہ تعالیٰ کو بیحد پسند ہے اور اس کے ذریعہ بندہ اللہ کی محبت اور اس کے قرب کا مستحق ہو جاتا ہے۔ یہی مفہوم اس حدیث کا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر تم گناہ نہ کرو تو اللہ تعالیٰ تمہیں دنیا سے ہٹا دے اور ایک ایسے گروہ کو لے آئے جس سے گناہ ہوں تو وہ اللہ سے مغفرت چاہے اور اللہ اسکی مغفرت فرما دے"

جیسا کہ اوپر گذر چکا توبہ و استغفار کے سلسلہ میں اصل چیز الفاظ نہیں بلکہ انسان کا گناہ سے باز آجانا، اس کی ندامت اور اس کا تضرع اور زاری اور اس کا بندگی کی طرف پلٹ آنا ہے۔ تاہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استغفار کے سلسلہ میں بعض جامع دعائیں بھی منقول ہیں اور ان کو سمجھ کر اور دل کے خشوع کے ساتھ پڑھا جائے تو

گناہوں کے معاف کرانے میں ان سے مدد ملے گی۔

ایک حدیث میں ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک نشست میں سَو سَو بار یہ استغفار پڑھتے ہوئے سنتے تھے:

رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَتُبْ عَلَيَّ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الْغَفُوْرُ۔	اے میرے رب میری مغفرت فرما اور رحمت کیساتھ میری طرف پلٹ آ۔ یقیناً تو بہت زیادہ توبہ قبول فرمانے والا اور مغفرت فرمانے والا ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ جو شخص اللہ کے حضور توبہ کرے اور یہ استغفار پڑھے تو اس کا بڑے سے بڑا گناہ معاف ہو جائے گا:

اَسْتَغْفِرُ اللهَ الَّذِيْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَيْهِ۔	میں اس اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی چاہتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ زندہ وجاوید ہے ساری کائنات کو سنبھالے ہوئے اور میں اس کی نافرمانی سے پلٹ کر اس کی بندگی کی طرف آتا ہوں۔

صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سیدالاستغفار (بہترین استغفار) یہ ہے کہ تم کہو:

اَللّٰهُمَّ اَنْتَ رَبِّيْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ خَلَقْتَنِيْ وَاَنَا عَبْدُكَ وَاَنَا عَلٰى عَهْدِكَ وَوَعْدِكَ مَا اسْتَطَعْتُ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا صَنَعْتُ اَبُوْءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَيَّ	اے اللہ تو میرا رب ہے۔ تیرے سوا کوئی میرا الٰہ نہیں، تو نے مجھے پیدا کیا اور میں پیدائشی تیرا بندہ ہوں، اور میں نے تجھ سے بندگی و اطاعت کا جو وعدہ اور عہد کیا ہے اس پر اپنی طاقت بھر قائم ہوں، اپنے بُرے کاموں کے شر سے بچنے کے لئے میں تیری پناہ میں آتا ہوں۔ تیرے احسانات

وَ اَبُوْءُ بِذَنْبِیْ فَاغْفِرْ لِیْ فَاِنَّہٗ لَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ ۔

جو مجھ پر ہیں میں انکا اعتراف کرتا ہوں اور میں اپنے گناہوں کا بھی اعتراف کرتا ہوں۔ تو میرے گناہوں کو معاف فرما دے۔ یقیناً تیرے سوا گناہوں کو معاف کرنے والا کوئی نہیں :: (بخاری)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص دل کے یقین کے ساتھ دن میں یہ استغفار کرے اور شام ہونے سے قبل مرجائے تو وہ جنتی ہوگا۔ اور جو شخص دل کے پورے یقین کے ساتھ رات کو یہ استغفار کرے اور صبح ہونے سے قبل مرجائے تو جنتی ہوگا۔

اِن دُعاؤں اور خصوصاً آخری دُعا سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بندے کا اللہ کیا تھ حقیقی تعلق کیا ہے، توبہ واستغفار کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ توبہ واستغفار کرتے وقت کس طرح کی کیفیات طاری ہونی چاہئیں۔ توبہ واستغفار کی فضیلت واہمیت کیا ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَیْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ یَأْمُرْ نَا بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْہَ عَنِ الْمُنْکَرِ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص ہم کو (مسلمانوں کو) نیک باتوں کا حکم نہ دے اور بُرے کاموں سے منع نہ کرے وہ ہم سے نہیں ہے :: (ترمذی)

تشریح: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ اُمت کے تمام لوگوں پر نیکی کا حکم کرنا اور بُرائی سے روکنا فرض ہے۔ اور یہ ایسا فریضہ ہے کہ اگر اس کو چھوڑ دیا جائے تو یہ خطرہ ہے کہ دوسرے دینی فریضے بھی مقبول نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ ۔ (پ ۴ رکوع ۲)

اے مسلمانو! تم بہترین امت ہو ۔ تم سارے انسانوں (کی اصلاح وتعمیر) کے لئے اٹھائے گئے ہو ۔ تم نیکی کا حکم کرتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو ۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسلمان تمام انسانوں کی اصلاح کے ذمہ دار ہیں ۔ ان کا فرض ہے کہ جس نیکی کو وہ مٹا ہوا دیکھیں اس کو زندہ کریں اور اپنے قوت واثر کو اس نیکی کے رائج کرنے میں لگا دیں ۔ جس برائی کو ابھرتا ہوا دیکھیں پوری قوت سے اس کو میٹ دیں اور خود دین وایمان کی زندگی گذاریں ۔ اس صورت میں وہ نیکی اور بھلائی کا سرچشمہ ہوں گے اور بجا طور پر "خیر امت" (بہترین امت) کہلانے کے حقدار ہوں گے ۔ ایک اور موقع پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُونِ مِنْ قَبْلِكُمْ أُولُو بَقِيَّةٍ يَنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْأَرْضِ إِلَّا قَلِيلًا مِمَّنْ أَنْجَيْنَا مِنْهُمْ وَاتَّبَعَ الَّذِينَ ظَلَمُوا مَا أُتْرِفُوا فِيهِ وَكَانُوا مُجْرِمِينَ ۝ وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرَىٰ بِظُلْمٍ وَأَهْلُهَا مُصْلِحُونَ ۝ ۔ (پ رکوع)

جو امتیں تم سے پہلے گذری ہیں ان میں ایسے سمجھدار لوگ کیوں نہ ہوئے جو زمین میں پھیلے ہوئے فساد کو روکتے بجز ان چند آدمیوں کے جنھیں (اپنے عذاب سے) بچا لیا ۔ رہے وہ لوگ جو اللہ کی نافرمانی کر کے اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے وہ اپنی خوش فعلیوں اور عیاشیوں میں لگے رہے اور وہ باغی ونافرمان تھے (چنانچہ وہ ہلاک کر دیئے گئے) حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب بستی والوں کو ظلماً ہلاک نہیں کرتا ۔ جب کہ وہ اپنی اور دوسروں کی اصلاح میں لگے ہوں ۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ کی نافرمانی اور فساد کے عام ہو جانے کی شکل میں اللہ کا عذاب آتا ہے اور اس عذاب سے صرف وہی لوگ بچتے ہیں جو اللہ کی نافرمانی سے بچنے کے ساتھ ساتھ برائی اور فساد کو بساط بھر روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر مسلمان کو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا مکلف ٹھہرایا ہے۔ آپ نے فرمایا "تم میں سے جو آدمی کسی برائی کو دیکھے اس کا فرض ہے کہ وہ اپنے ہاتھ سے بدل دے۔ اگر اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اسے زبان سے روکنے کی کوشش کرے۔ اور اگر یہ بھی نہ کر سکے تو دل سے اسے روکنے کی تمنا کرے اور یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔

ایک اور موقع پر بگڑے ہوئے مسلمانوں کی اصلاح پر زور دیتے ہوئے فرمایا "مجھ سے پہلے جس امت میں جو نبی آئے ان کو ان کی امت میں سے مخلص اور جاں نثار پیرو اور ساتھی ملے جو نبی کے طریقۂ زندگی کو مضبوطی کے ساتھ اختیار کرتے اور ان کے احکام کی تعمیل میں لگے رہتے لیکن ان مخلص اور جاں نثار پیروؤں کے بعد ایسے لوگ ان کے جانشین ہوئے جو ایمان واسلام کا دعویٰ کرتے مگر اس کے مطابق زندگی نہ گذارتے اور کام وہ کرتے جن کے کرنے کا انھیں حکم نہیں دیا گیا تھا۔ تو جو شخص ایسے لوگوں کی اصلاح کے لئے اپنے ہاتھ سے (قوت) کوشش کرے وہ مومن ہے۔ جو شخص ان کی اصلاح کے لئے اپنی زبان سے کوشش کرے وہ مومن ہے، جو شخص ان کی اصلاح کے لئے دل میں تمنا کرے وہ مومن ہے، اور اس کے بعد رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان نہیں ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے معلوم ہوا کہ نیکی کا حکم کرنا اور برائی سے روکنا ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے اور یہ ذمہ داری ہاتھ، زبان اور دل تینوں سے

ادا کرنی چاہیئے۔ ہمارا دل برائیوں کو دیکھ کر کڑھے، ہماری زبان برائیوں کے خلاف کھلے اور ہم اپنی قوت واثر کو برائی مٹانے اور نیکی کو فروغ دینے میں لگائیں۔ جو شخص برائی کو عام ہوتے ہوئے دیکھتا ہے اور اس صورت حال کے بدلنے کی تڑپ پیدا نہیں ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق اس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں۔

ایک اور موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی فریضہ کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے فرمایا جس قوم میں گناہوں اور خدا کی نافرمانیوں کا رواج عام ہو جائے اور اس صورت حال کو بدلنا ممکن ہو مگر لوگ بدلنے کی کوشش نہ کریں تو اس پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آتا ہے جو نیک اور بد سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔"

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ" اس خدا کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے تم نیکی کا ضرور حکم کرو گے اور برائی سے ضرور روکو گے ورنہ اللہ اپنے پاس سے تم سب پر عذاب بھیجے گا۔ پھر تم اس سے دعائیں کرتے رہو گے اور تمہاری دعائیں قبول نہ ہوں گی۔"

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے غفلت کا نتیجہ اللہ کا عذاب ہے جو نیک و بد سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ آج ہم مسلمان جن پیچیدہ اور لاینحل پریشانیوں اور مصیبتوں میں گھرے ہوئے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کی مختلف شکلیں ہیں اور ان سے ہم اسی وقت نجات پا سکتے ہیں جب ہم نیکی کو فروغ دینے اور برائی کو مٹانے کیلئے اٹھ کھڑے ہوں۔

انصار اللہ

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ　　رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَا مِنْ نَبِيٍّ بَعَثَهُ اللّٰهُ فِيْ أُمَّتِهٖ قَبْلِيْ إِلَّا كَانَ لَهٗ فِيْ أُمَّتِهٖ حَوَارِيُّوْنَ وَأَصْحَابٌ يَأْخُذُوْنَ بِسُنَّتِهٖ وَيَقْتَدُوْنَ بِأَمْرِهٖ ثُمَّ إِنَّهَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِهِمْ خُلُوْفٌ يَقُوْلُوْنَ مَالَا يَفْعَلُوْنَ وَيَفْعَلُوْنَ مَا لَا يُؤْمَرُوْنَ فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِيَدِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَيْسَ وَرَاءَ ذَالِكَ مِنَ الْإِيْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ۔ (مسلم)

مجھ سے قبل جو نبی بھی اپنی امت میں مبعوث ہوئے انھیں اپنی اُمت میں مخلص پیرو (راہِ حق کے) ساتھی ملے جو ان کی روش کو اختیار کرتے اور اُن کے احکام کی پیروی کرتے، پھر ناخلف ان کے بعد ان کے جانشین ہوئے جو دعویٰ تو کرتے مگر عمل نہ کرتے اور ایسے کام کرتے جن کے کرنے کا انھیں حکم نہیں دیا جاتا۔ ایسے لوگوں سے جو شخص اپنے ہاتھوں سے جہاد کرے وہ مومن ہے اور جو اُن سے اپنی زبان سے جہاد کرے وہ مومن ہے اور اُن سے اپنے دل سے جہاد کرے وہ مومن ہے اور اس کے بعد رائی کے دانے کے برابر ایمان نہیں ہے۔

تشریح: انبیاء علیہم السلام کے کچھ نام لینے والے ایسے بھی ہوتے ہیں جو ایمان و اسلام کا دم تو بھرتے ہیں لیکن ان کی زندگی ایمانی تقاضوں اور اسلامی کردار سے خالی ہوتی ہے۔ یہ لوگ بلا جھجک وہ کام کرتے ہیں جن سے اللہ اور اس کے رسول روکتے ہیں۔ یہ لوگ دعوائے ایمان میں جھوٹے ہیں۔

نام نہاد مسلمانوں کے بگاڑ کے خلاف جدوجہد کرنا ہر مومن کا بنیادی فریضہ ہے۔ یہ کوشش ہاتھ سے بھی ہونی چاہیئے، زبان سے بھی اور دل سے بھی۔ یہ جدوجہد بگاڑ کی اصلاح کے لئے بھی ہوگی اور اس کے اثرات کو روکنے کے لئے بھی۔ جو شخص

امتِ مسلمہ کے بگاڑ کو دور کرنے کے لئے نہ طاقت کا استعمال کرے، نہ زبان سے کام لے، نہ اس کا دل تڑپے، اس کا دل ایمان سے خالی ہے۔ جسے دین کی پامالی کا غم نہ ہو، اور نہ برائیوں کے برے ہونے کا احساس، وہ مومن کیسے ہو سکتا ہے۔ دین کو غالب کرنے کی انتھک جدوجہد کا نام "جہاد" ہے۔ یہ جہاد امت مسلمہ کا اہم ترین فریضہ ہے اور ایمان کے جانچنے کی بنیادی کسوٹی ہے۔ مسلمانوں کی اصلاح اس مہم کا ایک حصہ ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالْمُتَّقِيْنَ ۝ اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ ۔ (پ۱۰ رکوع ۱۳)

جو لوگ اللہ اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں وہ اے نبی تم سے اس بات کی اجازت نہیں چاہتے کہ اللہ کی راہ میں اپنی جان اور مال سے جہاد نہ کریں۔ اور اللہ متقیوں کو خوب جانتا ہے۔ تم سے اس بات کی اجازت تو وہی لوگ چاہتے ہیں جو نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں نہ آخرت پر۔ ان کے دلوں میں شک ہے تو وہ اپنے شکوک وشبہات میں سرگرداں رہیں۔

قرآن مجید سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جہنم کے عذاب سے بچنے، جنت کی نعمتیں پانے اور دنیا میں اللہ کی رحمت ونصرت کا مستحق بننے کی واحد شکل یہ ہے کہ مومن اللہ کے دین کو غالب کرنے اور اس کے پھیلانے کی انتھک کوشش کرے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ

اے ایمان لانے والو! کیا میں تم کو ایسا کاروبار بتاؤں جو تمہیں (اللہ کے) دردناک عذاب

مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ	سے نجات دے، وہ کاروبار یہ ہے کہ تم اللہ
بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَتُجَاھِدُوْنَ	اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اللہ کی
فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِاَمْوَالِکُمْ وَ	راہ میں اپنی جان اور مال سے جہاد کرو۔ یہی
اَنْفُسِکُمْ ط ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ	تمہارے لئے بہتر ہے بشرطیکہ تم جانتے
اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ یَغْفِرْ لَکُمْ	ہو۔ اس صورت میں اللہ تمہارے گناہوں
ذُنُوْبَکُمْ وَیُدْخِلْکُمْ جَنّٰتٍ	کو معاف فرمادے گا۔ اور تمہیں ایسی جنتوں
تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ	میں داخل فرمائے گا جن کے پائیں نہریں
وَمَسٰکِنَ طَیِّبَۃً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ	بہتی ہوں گی، اور ہمیشہ کی جنتوں میں بہترین
ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۝ وَاُخْرٰی	محلات میں داخل فرمائیگا، یہی عظیم الشان
تُحِبُّوْنَھَا ط نَصْرٌ مِّنَ اللّٰہِ	کامرانی ہے، اور ایک اور چیز عطا فرمائے گا یعنی
وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ ط وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝	اللہ کی مدد اور قریبی فتح اور (اے نبی) اہل
(پ ۲۸ رکوع ۹)۔	ایمان کو خوشخبری دو"۔

قرآن مجید اور صحیح احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے دین کو غالب کرنے کی جدوجہد دین کا سب سے بلند فریضہ ہے اور اس کا اجر غیر معمولی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دین کا سب سے اونچا کام جہاد ہے"۔ ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا "جہاد کے لئے ایک صبح یا شام کو نکلنا دنیا اور مافیہا سے بہتر ہے"۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو قدم اللہ کی راہ میں غبار آلود ہوں وہ جہنم میں نہیں جا سکتے"۔

احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دین کو غالب کرنے کی مہم کبھی ملتوی نہیں ہو سکتی۔ یہ مہم قیامت تک جاری رہنی چاہیئے خواہ اس کے لئے حالات سازگار ہوں

یا ناسازگار ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جہاد قیامت تک جاری رہے گا۔ کسی ظلم کرنے والے کا ظلم اور کسی انصاف کرنے والے کا انصاف اسے ختم نہیں کریگا۔

اللہ کے دین کو غالب کرنے اور پھیلانے کی مہم کو اللہ کی نصرت (مدد) سے تعبیر کیا گیا ہے اور جو لوگ اس مہم میں حصہ لیں گے اُن کو انصار اللہ (اللہ کے مددگار) کا معزز خطاب بخشا گیا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ	اے ایمان والو! اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا۔ اور تمہارے قدم جما دے گا۔
(پ۲۶ رکوع ۴)	

ایک اور مقام پر ہے:

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۭ فَاٰمَنَتْ طَّاۗىِٕفَةٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ وَكَفَرَتْ طَّاۗىِٕفَةٌ ۚ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰي عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ ۔	اے ایمان لانے والو! اللہ کے مددگار بنو۔ جیسا کہ عیسیٰ بن مریم نے حواریوں سے کہا تھا کہ اللہ کی راہ پر چلنے میں کون میرا مددگار ہے؟ حواریوں نے کہا ہم ہیں اللہ کے مددگار۔ تو بنی اسرائیل کا ایک گروہ ان پر ایمان لایا اور دوسرے گروہ نے انکار کیا۔ تو ہم نے ایمان لانے والوں کی ان کے دشمنوں کے خلاف مدد کی تو وہ غالب ہو گئے۔

(پ۲۸ رکوع ۹)

ان آیات سے معلوم ہوا کہ رسولوں کے سچے پیرو (حواریین) وہی لوگ ہوتے ہیں جو اللہ کے دین کو پھیلانے اور اسے غالب کرنے کی مہم میں حصہ لیتے ہیں۔ اور

یہ لوگ انصار اللہ کا خطاب پاتے ہیں جس سے بہتر اور بلند تر اور کوئی خطاب نہیں ہو سکتا۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ ہم اللہ کی مدد کے اور اہل باطل کے مقابلہ میں سربلندی اور کامرانی کے اس وقت مستحق ہو سکتے ہیں جبکہ ہم اللہ کے دین کو غالب کرنے کی عملاً جدوجہد کریں۔ عبادات میں مصروف ہو کر اور صرف دعائیں کر کے اللہ کی نصرت کے ہم مستحق نہیں ہو سکتے۔ اگر جہاد کئے بغیر دین کا غالب ہونا ممکن ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے برگزیدہ صحابہ اپنی زندگیاں جہاد فی سبیل اللہ میں نہ کھپاتے۔ اس راہ کی مشکلات انگیز نہ کرتے اور لاکھوں اہل ایمان اللہ کی راہ میں جانیں نہ دیتے۔ اس سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بہترین اسوہ یہ ہے کہ آپ نے تین سو تیرہ ۳۱۳ مسلمانوں کو ایک ہزار کے مقابلہ میں بدر کے میدان میں جہاد کے لئے لاکھڑا کیا اور پھر اللہ سے رو رو کر دعا کی کہ اگر یہ مختصر سا گروہ ختم ہو گیا تو پھر دنیا میں تیری بندگی نہ ہو سکے گی۔ اس دعا کے بعد اہل ایمان کے مختصر گروہ نے اپنے سے تین گنا طاقت سے ٹکر لی اور اللہ کی نصرت سے وہ ان کے مقابلہ میں سربلند و کامران ہوئے۔ صحابہ کرام و تابعین اور ہر زمانہ کے مخلص اہل ایمان نے یہی روش اختیار کی کہ اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لئے سر ہتھیلیوں پر لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ باطل کو مغلوب کرنے کے لئے جان و مال کی بازی لگا دی بالآخر اللہ کی طرف سے نصرت اور سربلندی کے مستحق ہوئے۔

ہر انسان حاکم و نگراں ہے

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلَا کُلُّکُمْ رَاعٍ وَّکُلُّکُمْ — سنو! تم میں سے ہر شخص راعی (حاکم) ہے اور

مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِہٖ۔ ہر ایک کو اپنی رعیت کے بارے میں جواب دہی کرنی ہوگی۔ (مشکوٰۃ)

تشریح: اس حدیث میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ ہر شخص اپنے ماتحت افراد کی پوری پوری دیکھ بھال کرے۔ اگر ان میں کوئی دینی، یا دُنیادی اعتبار سے کمی دیکھے تو اسے ہر ممکن طور پر دُور کرنے کی کوشش کرے۔ اگر اُس نے ایسا نہیں کیا تو اسے حشر کے دن اس کی جواب دہی کرنی ہوگی۔ رَاعی عربی زبان میں چرواہے نگراں اور حاکم و فرماں روا کو کہتے ہیں۔ چرواہے کو راعی اس لئے کہتے ہیں کہ وہ مویشیوں کا محافظ اور نگراں ہوتا ہے۔ اسی طرح بادشاہ بھی ساری رعایا کا نگہبان ہوتا ہے۔ اگر فرمانروا رعایا کی حفاظت اور نگرانی نہیں کرسکتا تو وہ حکومت کے قابل نہیں۔ اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس طرح فرمانروا سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہوگا اسی طرح تم میں سے ہر شخص جتنے جتنے حلقہ میں اثر رکھتا ہے اور حکومت کرتا ہے اس سے بھی اس حلقۂ اثر کے بارے میں سوال ہوگا۔ مثلاً ہر شخص اپنے گھر میں حاکم و فرمانروا ہوتا ہے اس سے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ پوچھے گا کہ تم نے اپنے بیوی، بچوں اور نوکروں کو نیکی کی راہ پر لگایا یا نہیں؟ اُنھیں بُرائی سے بچایا یا نہیں؟ اسی طرح محلہ کے چودھری سے پوچھا جائے گا کہ تم پورے محلے کے ذمہ دار تھے محلے والوں کو نیکی کا حکم کرتے اور بُرائیوں سے روکتے رہے یا نہیں؟ اسی طرح اُستادوں سے پوچھا جائے گا کہ تم اپنے شاگردوں کے نگراں تھے انھیں اپنی تعلیم و تربیت کے ذریعہ نیک اور خدا پرست بنایا یا نہیں؟ مانیٹروں اور درجہ کے بااثر لڑکوں سے پوچھا جائے گا کہ انھوں نے دوسرے لڑکوں کو نیک بنانے اور بُرائی سے بچانے کی کوشش کی یا نہیں؟ اور تمام طلبا سے یہ باز پُرس ہوگی کہ انھوں نے اپنی قوت

اور اپنے اثر کو فساد، تخریب، بدی اور ظلم کو فروغ دینے میں صرف کیا یا اپنی قوت و اثر سے اصلاح، تعمیر، انصاف، نیکی اور انسانیت کو رواج دیا؟۔

الغرض ہر شخص سے قیامت کے دن اس کے ماتحتوں اور حلقۂ اثر کے بارے میں سوال ہوگا۔ اس لئے ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرے اور اپنے حلقۂ اثر و تعارف میں نیکیوں کو فروغ دینے اور برائیوں کے مٹانے اور دین کا پیغام پہونچانے میں مصروف ہو جائے۔ کیونکہ آخرت میں اس سے اپنی ذات کے ساتھ اپنے حلقۂ تعارف و اثر کے بارے میں جواب دہی کرنی ہوگی۔

قرآن کی تعلیم

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ
خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَہٗ۔ (بخاری و مسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں بہترین آدمی وہ ہے جو قرآن مجید کو خود سیکھے اور دوسروں کو سکھلائے۔

تشریح: قرآن مجید ہدایت کا سرچشمہ، نجات کا ذریعہ اور اللہ کی رضا معلوم کرنے کا واحد راستہ ہے۔ اس کے علاوہ دنیا میں اچھی اور کامیاب زندگی گذارنے اور فلاح و ارتقاء سے ہمکنار کرنے کا باعث بھی ہے۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کا علم حاصل کرنے والوں اور اس علم کو عام کرنے والوں کو سب سے بہتر قرار دیا ہے۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "خدا کی تعظیم میں ایک بات یہ بھی ہے کہ بوڑھے کی تعظیم کی جاتے اور ایسے قرآن پڑھنے والے کی تعظیم کی جاتے جو قرآن کے احکام میں زیادتی نہ کرتا ہو اور نہ بدعمل ہو۔ اس روایت سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید کی تلاوت کا حقیقی مطلب یہ ہے کہ اس کو سمجھ کر

پڑھا جائے اور کسی کمی بیشی کے بغیر ٹھیک ٹھیک اس پر عمل کیا جائے۔ ایک اور موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "قرآن پڑھا کرو، قیامت کے دن پڑھنے والوں کی یہ شفاعت کرے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ شفاعت اسی وقت ممکن ہوگی جبکہ قرآن کا پڑھنے والا قرآن کو سمجھ کر اس کے مطابق عمل بھی کرے۔ ورنہ قرآن اس کے خلاف گواہ ہوگا۔ صحیح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

" (قرآن آخرت میں) تمہارے حق میں حجت بنے گا یا تمہارے خلاف۔

ایک موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " تم میں سے کون اسے پسند کرتا ہے کہ صبح کو بطحان یا عقیق (دو مقاموں کے نام) چلا جائے اور حق تلفی اور قطع رحم کئے بغیر بڑے کوہان کی دو قیمتی اونٹنیاں لے آئے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے کہا اے اللہ کے رسول! ہم میں سے ہر آدمی اسے پسند کرتا ہے۔ فرمایا " تو تم میں سے کوئی مسجد میں کیوں نہیں چلا جاتا اور وہاں جا کر کتاب اللہ کی دو آیتیں کیوں نہیں سیکھتا یا پڑھتا۔ یہ اس کے لئے (ایسی) دو اونٹنیوں سے بہتر ہوگا اور تین آیتیں تین اونٹنیوں سے اور چار آیتیں چار اونٹنیوں سے۔ اور اسی طرح جتنی آیات وہ سیکھے گا یا پڑھے گا وہ اتنی (قیمتی) اونٹنیوں سے بہتر ہوگا۔

دو کوہان والی اونٹنیاں عرب میں بہت نادر تھیں اور بہت قیمتی شمار ہوتی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی آیات کو ان اونٹنیوں سے زیادہ قیمتی قرار دیا، کیونکہ یہ اونٹنیاں کتنی ہی قیمتی سہی، مگر ان کی افادیت اور قیمت محدود ہے اور صرف اس دنیا کی حد تک۔ جبکہ قرآن مجید کی تعلیمات دنیا و آخرت دونوں کی لامحدود کامرانیوں کی موجب ہیں۔ ان تعلیمات کے ذریعہ نہ صرف افراد بلکہ قومیں دنیا و آخرت دونوں کی سربلندی حاصل کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ صحابہ کرام رضوان

اللہ علیہم اجمعین کو ہر طرح کی سر بلندیاں حاصل ہوئیں۔ اور قرآن مجید کی تعلیمات کو چھوڑ کر دنیا و آخرت دونوں میں ذلت و نامرادی ہاتھ آتی ہے۔ جیسا کہ موجودہ دور کے مسلمان کا حال ہے۔ یہی وہ بات ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعہ بہت سے قوموں اور گروہوں کو رفعت اور سر بلندی عطا فرمائے گا اور کچھ دوسرے گروہوں اور قوموں کو (اس کی حق تلفی کے نتیجہ میں) پست و نامراد بنا دے گا۔

ایک اور روایت میں ہے کہ صاحب قرآن سے (آخرت میں) کہا جائے گا (قرآن) پڑھتے جاؤ اور (بلند مدارج) پر چڑھتے جاؤ اور (دیکھو) ٹھہر ٹھہر کر (اور اطمینان سے) پڑھنا جس طرح تم دنیا میں ٹھہر ٹھہر کر (ترتیل سے) پڑھتے تھے۔ تمہارا مقام وہاں ہوگا جہاں تم آخری آیت تلاوت کر دگے۔ اس حدیث سے ایک بات معلوم ہوئی کہ قرآن بہت ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا چاہیئے کیونکہ اس طرح قرآن کو سمجھنے اور اسے اپنے اندر جذب کرنے کا حق ادا کیا جا سکتا ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ مومن قرآن کو جس قدر ٹھہر ٹھہر کر پڑھے گا اور جتنا زیادہ سمجھے گا اور جذب کرے گا اور اس کے مطابق اپنی زندگی ڈھالے گا اسی قدر آخرت میں اس کے مراتب بلند ہوں گے کیونکہ آخرت انسان کی دنیوی زندگی کا عکس ہے۔ اگر انسان نے دنیا میں اللہ کی بغاوت و نافرمانی کی زندگی گذاری ہے تو اس کا نتیجہ جہنم کے ہولناک عذاب کی شکل میں اس کے سامنے آئے گا۔ اور اگر اس نے اللہ کی اطاعت و وفاداری کی راہ اختیار کی ہے تو وہ آخرت میں جنت اور اس کی ابدی اور بے پایاں نعمتیں پائے گا۔ اور اللہ کی اطاعت و وفاداری اور اس کی رضا جوئی اسی وقت ممکن ہے جبکہ انسان اللہ کی کتاب قرآن مجید کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لے اور اپنی زندگی

کو اس کے مطابق ڈھال لے۔ یہی وہ بات تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح فرمائی کہ میں تم میں دو بھاری چیزیں چھوڑے جاتا ہوں۔ ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جاتا ہوں جب تک تم ان دونوں کو مضبوطی سے پکڑے رہو گے ہرگز گمراہ نہ ہو گے" اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت" اس روایت میں کتاب اللہ کے ساتھ سنت رسول اللہ کا بھی ذکر ہے جو قرآن مجید کی عملی شرح ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا کہ" قرآن آپ کا کردار تھا۔ ایک اور مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" قرآن کا ماہر (قرآن) لکھنے والا بزرگ اور نیک (فرشتوں) کا ہم مرتبہ ہے اور جو شخص (مہارت نہ ہونے کی وجہ سے) قرآن کو اٹک اٹک کر پڑھتا ہے اور اُسے پڑھنے میں زحمت ہوتی ہے اس کے لئے دُہرا اجر ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہُوا کہ جس طرح قرآن کی وحی لانے والے فرشتے قرآن کی حفاظت کرتے اور اسے انسانوں کی رہنمائی کے لئے اللہ کے رسول تک پہونچاتے ہیں اسی طرح قرآن کا سچا عالِم قرآن کی تعلیمات کی حفاظت کرتا ہے اور ان تعلیمات کو لوگوں میں عام کرتا ہے اس لئے اُن فرشتوں کا ہم مرتبہ ہے جو حاملان قرآن ہیں۔ وہ شخص جو علوم قرآن کا ماہر نہیں ہے بلکہ اسے قرآن کے پڑھنے اور سمجھنے میں بھی دِقت پیش آتی ہے اس کا اجر بھی کچھ کم نہیں ہے۔ اسے ایک اجر تو قرآن پڑھنے اور سمجھنے کا ہے، دوسرا اُن زحمتوں کا جو اسے اس راہ میں پیش آتی ہیں۔

ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا" اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ۔ بقیناً شیطان اس گھر سے بھاگتا ہے جس میں سورۂ بقرہ پڑھی جاتی ہو سورۂ بقرہ

کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس لئے کیا گیا ہے کہ قرآن مجید کی سب سے طویل سورۃ ہے اور اس میں قرآن مجید کے بیشتر احکام بیان کئے گئے ہیں۔ یہی نہیں، اس میں بنی اسرائیل کا تفصیلی اور دردناک تذکرہ بھی ہے۔ جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اگر کوئی گروہ کتاب اللہ کی حق تلفی کرتا ہے تو جلیل القدر انبیاء ورسل کی اولاد ہونے کے باوجود دُنیا و آخرت دونوں میں اللہ کے ہولناک عذاب سے نہیں بچ سکتا۔ ظاہر ہے کہ جس گھر میں قرآن مجید اور خصوصیت سے سورۃ بقرہ سوچ سمجھ کر پڑھی جائے اس کے رہنے والوں پر شیطان کا جادو نہ چلے گا اور وہ گھر اللہ کے حفظ و امان میں آجائے گا۔

ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا" جو لوگ اللہ کے گھر (مسجد) میں جمع ہو کر اللہ کی کتاب پڑھتے اور اسے آپس میں سمجھتے اور سمجھاتے ہیں اُن پر اللہ کی طرف سے سکینت نازل ہوتی ہے۔ (سکینت قلبی سکون و اطمینان اور انشراح کی ایک خاص کیفیت کو کہتے ہیں جو اللہ کے فضل سے اللہ کے وفادار بندوں کو حاصل ہوتی ہے اور اس لئے حاصل ہوتی ہے کہ وہ عقیدت و اخلاص کے ساتھ خود کو اللہ کے حوالے کر دیتے ہیں اور اللہ کی رضا کے لئے اپنی خواہشات، اپنے مفادات اور جان و مال سب کچھ قربان کرنے کو تیار رہتے ہیں)۔ اللہ کی رحمت انھیں ڈھانپ لیتی ہے، فرشتے اُن پر سایہ فگن ہوتے ہیں اور اللہ ان کا ذکر ان (مقرب فرشتوں) میں کرتا ہے جو اس کے پاس ہیں۔ اور جس شخص کا عمل اسے پیچھے کر دے اس کا نسب اُسے آگے نہیں بڑھا سکتا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ یہ قلبی کیفیت اور اللہ کی وفاداری و اطاعت کی راہ پر مخلصانہ آگے بڑھنے کی توفیق اللہ کے اُن بندوں کو نصیب ہوتی ہے جو اس

کی کتاب قرآن مجید کو عقیدت واحترام کے ساتھ سمجھنے اور سمجھانے اور اسے اپنی زندگی میں اُتارنے میں منہمک رہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت ایسے لوگوں کو ڈھانپ لیتی ہے، اللہ کے فرشتے ان پر سایہ فگن ہوتے ہیں اور اللہ اپنے مقرب ترین فرشتوں میں اعزاز واکرام کے ساتھ ان کا ذکر فرماتا ہے۔ حدیث کے آخری جملہ سے معلوم ہوا کہ قرآن کے پڑھنے پڑھانے کا یہ اجر اُن لوگوں کے لئے ہے جو قرآن پر ٹھیک ٹھیک عمل کرتے ہوں۔ جو لوگ عمل کے میدان میں پیچھے ہوں اُن کا نسب انھیں دُنیا وآخرت میں بلند مرتبہ نہیں بنا سکتا۔ ان کا حشر وہی ہوگا جو انبیاء علیہم السلام کی اولاد بنی اسرائیل کا ہُوا ——— قرآن مجید کی تلاوت کے آداب جو قرآن مجید اور صحیح احادیث سے معلوم ہوئے ہیں اور جنھیں ملحوظ رکھ کر ہی ہم مذکورہ بالا اجر و ثواب کے مستحق ہو سکتے ہیں حسب ذیل ہیں:

(۱)۔ قرآن مجید کو پورے ادب واحترام سے اس یقین کے ساتھ پڑھا جائے کہ یہ دونوں جہان کے آقا وفرمان روا اور ہمارے حقیقی محسن و پروردگار کا کلام ہے، جو اُس نے اپنے کرم سے ہماری ہدایت اور دُنیا وآخرت کی فلاح وکامرانی کے لئے بھیجا ہے اس کا ایک ایک لفظ حق وصداقت کا آئینہ ہے۔

(۲)۔ یکسوئی اور توجہ کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر اسے سمجھنے کی پوری کوشش کی جائے۔ کتاب کوئی بھی ہو، اس کے پڑھنے کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اسے سمجھ کر پڑھا جائے۔ بے سمجھے پڑھنے کو پڑھنا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اور کتاب انسان کے لئے اسی وقت مفید ہو سکتی ہے جب اسے سمجھ کر پڑھا جائے۔ یہ کتنی بڑی ناسمجھی اور بدبختی کی بات ہے کہ ہم مسلمان یہ خیال کرتے ہیں کہ قرآن مجید کی تلاوت کا یہ مطلب ہے کہ بے سمجھے بوجھے اس کے حروف کو زبان سے ادا کر دیا جائے۔ اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس تلاوت کے

نتیجہ میں ہم کو وہ سارے فائدے اور اجر حاصل ہوں گے جن کا ذکر قرآن و حدیث میں ہے حالانکہ قرآن مجید سے فائدے اسی وقت حاصل ہو سکتے ہیں جبکہ اسے غور و فکر کے ساتھ پڑھا جائے۔ قرآن مجید نے بار بار اس کی طرف متوجہ کیا ہے۔ ایک جگہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ کیا یہ لوگ قرآن مجید میں غور نہیں کرتے یا کیا ان کے دِلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں۔ ایک سورۃ میں اس ایک آیت کو بار بار دُہرایا گیا ہے کہ :

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ۔ (پ ۲۷ رکوع ۸-۹)

ہم نے قرآن کو نصیحت و یاد دہانی کیلئے آسان کر دیا ہے تو کیا کوئی اس سے نصیحت حاصل کرنیوالا ہے۔

قرآن مجید اور صحیح احادیث کے صریح ارشادات کے علی الرغم بعض بے وقوف دیندار یہ خیال کرتے ہیں کہ قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھنے سے انسان گمراہ ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ اس طرح کے خیالات کا کُھلم کُھلا اظہار کرتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ قرآن مجید جو قیامت تک کے لئے انسانوں کے واسطے ہدایت و رہنمائی بن کر آیا ہے اور نصیحت و یاد دہانی کے لئے اسے اللہ نے خود آسان کر دیا ہے اگر اس سے بھی انسانوں کو گمراہی ملے گی تو ہدایت پھر کس چیز سے نصیب ہو گی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اس بات سے ڈرتے ہیں کہ قرآن مجید کی روشنی پھیلنے سے جہالت کے پردے چاک ہوں گے۔ اور انھوں نے دین کے نام پر جو من مانی باتیں پھیلا رکھی ہیں لوگ ماننا چھوڑ دیں گے۔ اسی لئے وہ قرآن سمجھنے اور سمجھانے سے لوگوں کو روکتے ہیں۔

(۳)۔ قرآن مجید میں جن کاموں کے کرنے کا ذکر ہو ان کے بارے میں اپنا جائزہ لیا جائے اور ان کے کرنے کا پکا ارادہ کیا جائے۔ اور جن باتوں سے روکا گیا ہو اُن کے بارے میں اپنا جائزہ لیا جائے اور ان سے بچنے کا پختہ عہد کیا جائے۔ قرآن مجید اسی لئے اُترا ہے اور جو شخص اسے پڑھ رہا ہے اسے یقین کرنا چاہیئے کہ یہ سب باتیں اسی

سے کہی جا رہی ہیں۔

(۴)۔ قرآن مجید میں آخرت کا بہت ذکر ہے۔ اسے خوب غور سے پورے یقین کے ساتھ دل و دماغ میں بٹھا بٹھا کر پڑھنا چاہیئے۔ عذاب کا ذکر آتے تو اس سے ڈرنا چاہیئے اور اللہ کی پناہ چاہنا چاہیئے۔ اور جنّت کا ذکر آئے تو خوب شوق سے آسے پڑھنا چاہیئے۔ اور اس کے لئے دُعا کرنی چاہیئے اور یہ غور کرنا چاہیئے کہ وہ کون سے کام ہیں جو جنّت یا دوزخ میں لے جاتے ہیں۔ پھر اپنے اوپر نظر ڈالنا چاہیئے کہ کس طرح کے کام کر رہے ہیں۔

(۵)۔ قرآن مجید میں پچھلی ہلاک شدہ قوموں کا ذکر بہت آیا ہے ان واقعات سے سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ اور ان تمام کاموں سے بچنے کا عہد کرنا چاہیئے جن کے باعث یہ قومیں تباہ ہوئیں اور اللہ کے عذاب کے خوف سے کانپنا چاہیئے۔

(۶)۔ قرآن مجید میں انبیاء علیہم السلام، ان کے ساتھیوں اور اہل ایمان کے کارنامے حالات اور صفات بہت بیان ہوئے ہیں۔ انھیں غور سے پڑھیں اور ان کو برابر اپنے سامنے رکھیں اور ان کی پیروی کا عہد کریں۔

(۷)۔ آخرت کو دنیا کے مفادات پر ترجیح دینے کی قرآن مجید میں بہت تاکید ہے۔ اس کو خوب یاد رکھیں اور اس کی روشنی میں اپنا جائزہ لیں۔

(۸)۔ قرآن مجید میں سچے اہل ایمان کی صفات اور ان کا کردار بار بار واضح کیا گیا ہے۔ ان صفات اور کردار کو بہت غور سے پڑھیں اور اس کے آئینہ میں اپنا کردار دیکھیں اور جو نقص نظر آئے اسے دُور کرنے کی کوشش کریں۔

(۹)۔ قرآن مجید میں جگہ جگہ منافقین کی صفات اور ان کا کردار بیان ہوا ہے ان صفات اور ان کردار کو نگاہ میں رکھ کر اپنا جائزہ لیتے رہیں اور یہ دیکھتے رہیں کہ

ہم میں نفاق کی کوئی علامت تو نہیں پائی جاتی۔ صحابہ کرام اور تابعین کرام ہر آن اس اندیشے سے کانپتے رہتے تھے کہ کہیں ان کا شمار منافقین میں نہ ہو جائے۔

(۱۰)۔ قرآن مجید کی تعلیمات کو اللہ کے دوسرے بندوں، مسلمانوں اور غیر مسلموں تک پہونچانے کی کوشش کی جائے۔ کیونکہ ہر مسلمان کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ قرآن اور اسلام کے پیغام کو دوسرے انسانوں تک پہونچائے۔ اگر اس نے اس میں کوتاہی کی تو اس کی سخت پکڑ ہوگی۔ اور اللہ کا پیغام نہ پہونچنے کے نتیجہ میں جو لوگ گمراہ ہوں گے ان کی گمراہی کا وبال اس شخص پر آئے گا جو قرآن کی تعلیمات سے واقف تھا مگر اس نے ان تعلیمات کو اللہ کے دوسرے بندوں تک پہونچانے کی ذمہ داری ادا نہ کی۔"

علمِ دین

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
مَنْ یُّرِدِ اللّٰہُ بِہٖ خَیْرًا یُّفَقِّہْہُ فِی الدِّیْنِ۔	اللہ جس کے ساتھ بھلائی کرنا چاہتا ہے اسے دین کا علم اور دینی بصیرت عطا فرما دیتا ہے۔

تشریح: انسان کی دنیا و آخرت کی خیر و فلاح اللہ کے دین میں ہے۔ اور اللہ کی طرف سے اس کا دین آنا ہی اس لئے ہے کہ وہ انھیں دنیا و آخرت میں خیر و صلاح اور فلاح و کامرانی سے ہمکنار کرے۔ لیکن اللہ کے دین کا فائدہ اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ انسان اللہ کے دین کا علم حاصل کرے، اسے اپنی زندگی میں جذب کرنے کی کوشش کرے۔ حدیث میں اسی حقیقت کا انکشاف کیا گیا ہے۔ فقہ یا تفقہ بمعنی علم اور گہری دینی بصیرت کو کہتے ہیں۔ ایسا علم اور ایسی بصیرت جو انسان کے دل و دماغ اور اس کے ظاہر و باطن پر چھا جائے۔ کھلی بات ہے کہ ایسا علم انسان کو دنیا و آخرت کی کامرانی

سے ضرور ہمکنار کرے گا۔ ایک اور موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص علم حاصل کرنے کے لئے کوئی راستہ چلتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ جنت تک پہونچنے کے لئے راستہ اس کے واسطے آسان کر دیتا ہے۔ اور جو گروہ اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں جمع ہو کر اللہ کی کتاب کی تلاوت کرتا ہے اور اسے پڑھتا اور پڑھاتا ہے اس پر اللہ کی سکینت نازل ہوتی ہے۔ اللہ کی رحمت اسے ڈھانپ لیتی ہے اور فرشتے اس پر سایہ فگن ہوتے ہیں۔ اور اللہ ان فرشتوں کی محفل میں ذکر فرماتا ہے جو اس کے پاس ہوتے ہیں۔ اور جس شخص کا علم اسے پیچھے ڈال دے اس کا نسب اسے آگے نہیں بڑھا سکتا۔ اس حدیث سے کئی باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ علم کی راہ جنت تک پہونچنے کی راہ ہے اور علم حاصل کئے بغیر جنت تک کوئی شخص نہیں پہونچ سکتا۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ علم سے مُراد اللہ کی کتاب اور اس کے دین کا علم ہے۔

اور تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ آخرت کی کامرانی کے علاوہ اللہ کی کتاب اور اس کے دین کا علم حاصل کرنے سے دُنیا میں بھی مرد مومن کو اللہ تعالیٰ کی بہت سی نعمتیں ملتی ہیں۔ اس کا دل سکون واطمینان اور یقین وانشراح کی دولت سے مالا مال ہوتا ہے۔ دین کو جاننے اور اس پر عمل کرنے کے نتیجہ میں اس پر اللہ کی رحمت چھا جاتی ہے۔ اور وہ اس کی رحمت ونصرت کا مستحق ہو جاتا ہے۔ اللہ کے فرشتے اس کا ساتھ دیتے ہیں اور اس کے لئے دعائیں کرتے ہیں اور اللہ اپنے مقرب فرشتوں میں اس کا ذکر کرتا ہے۔ اور چوتھی بات یہ ہے کہ علم وہی معتبر ہے جو عمل کا ذریعہ بنے۔ اگر انسان دین کا علم حاصل کرنے کے بعد اس پر عمل کرنے کی توفیق نہ پائے تو نہ اس کا علم اس کے کام آئے گا اور نہ اس کا نسب۔ بلکہ ایسا علم اس کے خلاف حجت ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے علم سے پناہ مانگی ہے۔ آپ جو جامع دُعائیں مانگتے

تھے اُن میں سے ایک دُعا یہ ہے:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ عِلْمٍ لَا یَنْفَعُ وَمِنْ قَلْبٍ لَا یَخْشَعُ وَمِنْ نَفْسٍ لَا تَشْبَعُ وَمِنْ دَعْوَۃٍ لَا یُسْتَجَابُ لَھَا۔

اے اللہ میں تیری پناہ چاہتا ہوں ایسے علم سے (جو بے عملی کے باعث) نفع نہ دے۔ ایسے دل سے جس میں خشوع اور عاجزی نہ ہو، ایسے نفس سے جو کبھی سیر نہ ہو اور ایسی دُعا سے جو قبول نہ ہو۔

علم دین کی یہی اہمیت ہے جس کے سبب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حصولِ علم کو ہر مسلمان کے لئے لازمی قرار دیا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔ اور یہ فرض کوئی معمولی فرض نہیں ہے بلکہ دین کے تمام فرائض سے مقدم اور اہم ہے۔ کیونکہ جب تک انسان کو دین کا علم حاصل نہ ہوگا اسے یہ بات کیسے معلوم ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے کون سے امور فرض کئے ہیں، کن کاموں سے اسے روکا ہے، جنّت کا راستہ کونسا ہے اور جہنم کا کونسا؟۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے اللہ کی خشیت اور ہدایت کو علم پر موقوف کیا ہے۔ اللہ نے فرمایا:

قُلْ ھَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ۔ (پ ۲۳ رکوع ۱۴)

آپ فرما دیجئے کہ کیا وہ برابر ہو سکتے ہیں جو علم رکھتے ہیں اور جو نہیں رکھتے۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا ط (پ ۲۲ رکوع ۱۵)

اللہ سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو اس کے دین کا علم رکھتے ہیں۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

یَرْفَعِ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا

تم میں سے جو ایمان لائے اور جنھیں

مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ط (پ۲۸ رکوع ۲) علم بخشا گیا انھیں اللہ تعالیٰ بلند درجات عطا فرمائے گا۔

ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی میں تشریف لائے۔ مسجد نبوی میں دو حلقے قائم تھے۔ ایک حلقہ ان لوگوں کا تھا جو اللہ کی عبادت یعنی نفل نمازوں کی ادائیگی میں مشغول تھا۔ دوسرا حلقہ ان لوگوں کا تھا جو علم دین کے سیکھنے اور سکھانے میں لگا ہوا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے حلقے کو پہلے حلقے پر ترجیح دی اور یہ فرما کر اس حلقہ میں شریک ہو گئے کہ "مجھے بھی معلّم بنا کر بھیجا گیا ہے"۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دین کا علم حاصل کرنا اور دین کا علم پھیلانا اسلام میں غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا بنیادی کام بھی یہی تھا یعنی دین کا علم عام کرنا قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ۔ (پ۴ رکوع ۸)

یقیناً اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان پر کرم فرمایا کہ اُن میں ایک رسول اُنہی میں سے بھیجا جو اُن کو اللہ کی آیتیں پڑھ کر سُناتا ہے۔ ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

ایک اور موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "رشک دو ہی انسانوں کے سلسلہ میں جائز ہے۔ ایک وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ دولت دے اور اسے راہِ حق میں اس دولت کے لٹانے پر مامور کر دے، اور ایک وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ حکمت (دینی علم وبصیرت) عطا فرمائے تو وہ اس کے ذریعہ معاملات کا فیصلہ فرمائے اور اسے عام کرے"۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایک مادی دولت ہے۔ اگر کوئی

شخص اسی دولت کو بے محابا اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے تو وہ قابل رشک ہے۔
دوسری دولت علم کی ہے جس کے ذریعہ اگر کوئی شخص اپنے دوسروں کے معاملات کا صحیح صحیح فیصلہ کرتا ہے اور اس علم کو عام کرتا ہے تو وہ قابل رشک ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب انسان مرجاتا ہے تو اس کا عمل بھی ختم ہوجاتا ہے لیکن تین طرح کا عمل باقی رہتا ہے۔

(۱)۔ صدقہ جاریہ۔

(۲)۔ انسان کا علم جس سے انسان فائدہ اٹھائیں۔

(۳)۔ نیک اولاد جو والدین کے لئے دعا کرے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر انسان دین کے علم کو عام کرے تو جتنی نسلوں تک وہ علم پھیلے گا اور اس سے لوگ فائدہ اٹھائیں گے اور اس علم کے نتیجہ میں ان کی زندگیاں نیکی اور دینداری کے سانچے میں ڈھلیں گی صاحب علم کو ان سب انسانوں کی نیکی اور دین داری کا اجر ملتا رہے گا۔ چنانچہ ایک اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو شخص کسی کو بھلا کام بتائے گا تو اس کو اس کے کرنے والے کے برابر اجر ملے گا"

لیکن علم دین کے سیکھنے اور سکھانے کا یہ اجر اس وقت ہے جبکہ انسان دین کے علم کو کسی کمی بیشی کے بغیر لوگوں تک پہونچائے اور اس میں کوئی گڑبڑ نہ کرے اور نہ علم کے بغیر کوئی بات کہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میری طرف سے دین کی باتیں پہونچاؤ خواہ وہ ایک ہی آیت کیوں نہ ہو۔ اور بنی اسرائیل کی باتیں بھی بیان کرسکتے ہو، اس میں کوئی حرج نہیں۔ اور جو شخص میرے اوپر دانستہ جھوٹ باندھے وہ اپنا ٹھکانہ

دوزخ میں بنالے" ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" اللہ تعالیٰ علم کو دُنیا سے اس طرح نہیں سمیٹ لے گا کہ اپنے بندوں سے نکال لے بلکہ علم کو علماء کے فنا کرنے کے ذریعہ ختم کر دے گا۔ جب کوئی عالم باقی نہ رہے گا تو لوگ جاہلوں کو اپنا سردار بنالیں گے جن سے دین کے مسائل معلوم کئے جائیں گے تو وہ علم کے بغیر فتویٰ دیں گے۔ وہ خود گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کر دیں گے۔ علم دین کے موجبِ اجر اور نفع بخش ہونے کی دوسری شرط یہ ہے کہ علم صرف اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے حاصل کیا جائے۔ اس کے علاوہ اس کی اور کوئی غرض نہ ہو۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" جو شخص کوئی علم جسے اللہ کی رضا کے لئے حاصل کرنا چاہیئے (یعنی علم دین) اس لئے حاصل کرے کہ اس کے ذریعہ دُنیا کمائے تو قیامت کے روز جنّت کی خوشبو بھی نہ پائے گا۔

ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص دین کا علم اس لئے حاصل کرے کہ اس کے ذریعہ علماء کا مقابلہ کرے، نادانوں سے بحث کرے اور لوگوں کی توجہات اپنی طرف مبذول کرے اللہ ایسے شخص کو جہنم میں داخل کرے گا۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن سب سے پہلے جن لوگوں کا فیصلہ ہوگا ان میں سے ایک آدمی وہ ہوگا جو اللہ کی راہ میں شہید ہوا ہوگا، اسے اللہ کے حضور لایا جائے گا۔ پھر خدا اسے اپنی نعمتیں یاد دلائے گا اور اسے وہ سب نعمتیں یاد آجائیں گی۔ تب پوچھے گا کہ تو نے میری نعمتیں پاکر کیا کام کئے؟ وہ عرض کرے گا میں نے تیری راہ میں جہاد کیا،

یہاں تک کہ میں شہید ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا تم جھوٹ کہتے ہو۔ تم نے اس لئے جنگ کی کہ تم کو لوگ بہادر کہیں۔ تو تمہیں بہادر کہدیا گیا۔ پھر حکم ہو گا کہ اسے منہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دو۔ چنانچہ اسے جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔" اور ایک وہ شخص جس نے علم سیکھا اور سکھایا ہو گا اور قرآن پڑھا ہو گا اسے اللہ کے حضور لایا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس سے اپنی نعمتوں کا ذکر فرمائے گا۔ وہ ان نعمتوں کو جان لے گا۔ اللہ تعالیٰ پوچھے گا کہ تم نے ان نعمتوں کا کیا کیا؟ وہ عرض کریگا میں نے علم سیکھا اور سکھایا اور تجھے راضی کرنے کے لئے قرآن پڑھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا تم جھوٹ بولتے ہو، تم نے علم اس لئے سیکھا کہ لوگ تمہیں عالم کہیں اور قرآن اس لئے پڑھا کہ تمہیں ماہر قرآن کہا جائے، تو تمہیں یہ سب کچھ کہدیا گیا۔ پھر اس کے بارے میں حکم ہو گا کہ اسے منہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے۔" ایک اور شخص ہو گا جسے اللہ نے فارغ البالی بخشی ہو گی اور ہر طرح کے مال و دولت سے نوازا ہو گا۔ اسے اللہ کے حضور لایا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس سے اپنی نعمتوں کا ذکر فرمائے گا۔ وہ ان نعمتوں کو جان لے گا۔ اللہ تعالیٰ دریافت فرمائے گا کہ تم نے ان نعمتوں کا کیا کیا؟ وہ عرض کرے گا کہ میں نے کوئی ایسی راہ نہ چھوڑی جس میں خرچ کرنا تم کو پسند ہو، اِلّا یہ کہ میں نے تیری رضا کے لئے اس میں خوب خرچ کیا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا کہ تم جھوٹ بولتے ہو۔ تم نے یہ سب کچھ اس لئے کیا کہ لوگ تمہیں سخی کہیں۔ تو تمہیں سخی کہدیا گیا۔ پھر حکم ہو گا کہ اسے منہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں جھونک دیا جائے۔"

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ شہادت یا علم دین کا سیکھنا سکھانا ہو یا اِنفاق فی سبیل اللہ ہو، یا کوئی بڑے سے بڑا دینی کام اسی وقت موجب اجر ہے جب وہ شخص اللہ کی رضا کے لئے ایسا کرے۔ کوئی کام خواہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، اگر وہ

نام ونمود کے لئے ہے تو وہ موجب اجر ہونے کے بجائے جہنم میں جانے کا ذریعہ بنے گا۔

علم دین کے موجب اجر اور نفع بخش ہونے کی تیسری شرط یہ ہے کہ صاحب علم علم دین کو چھپانے سے پرہیز کرے اور بے کم وکاست اسے لوگوں تک پہونچادے۔

قرآن مجید میں علمائے بنی اسرائیل کو مخاطب کرکے کہا گیا ہے کہ حق کو باطل کے ساتھ گڈمڈ نہ کرو۔ اور حق کو جان کر چھپاؤ نہیں۔ (پ رکوع ۵)

ایک اور جگہ فرمایا گیا:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَالْھُدٰی مِنْۢ بَعْدِ مَا بَیَّنّٰہُ لِلنَّاسِ فِی الْکِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِکَ یَلْعَنُھُمُ اللّٰہُ وَیَلْعَنُھُمُ اللّٰعِنُوْنَ۔ (پ۲ رکوع۳)

ہم نے جو کھلے ہوئے احکام اور ہدایت کی جو باتیں نازل کیں اور انھیں لوگوں پر واضح کردیا جو لوگ دین کی ان باتوں کو چھپاتے ہیں اللہ اور لعنت بھیجنے والے اس پر لعنت بھیجتے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص سے دین کی بات پوچھی جائے اور وہ چھپائے تو قیامت کے دن اس کے منہ میں آگ کی لگام لگائی جائے گی۔

تمت بالخیر